

دیدۂ دل

پروفیسر شیخ محمد اقبال

دیدۂ دِل

پروفیسر شیخ محمد اقبال
ایم اے انگلش،
ایم اے اردو۔ ایم فل اقبالیات

اشاعتِ اوّل ——— ۱۹۹۸ء

تعداد ——— ۰۰

طابع ——— ثنائی پریس سرگو

قیمت ——— ۴۰/- رو

خطاطی ——— شاہد مح

سرورق ——— محمد انیس ڈیزائن پوائنٹ امین

ناشر ——— شعبہ نشر و اشاعت پاکستان الیسو
آف دی بلائنڈ سرگ

ملنے کا پتہ: ——— ۱۴۱۔ رحمت پارک کالج روڈ سرگو

مصنّف کی دیگر کُتب

۱۔ ساحلِ تشنہ لب (شعری مجموعہ)

۲۔ سوالیہ نشان (شعری مجموعہ)

۳۔ جون ڈن شخصیت اور شاعری (تنقید)

۴۔ اِک ہم سفر اچھّا لگا (شعری مجموعہ)

۵۔ رُومانی انگریزی شعراء کے علامہ اقبال پر اثرات
(تنقیدی مقالہ زیرِ طباعت)

۶۔ جہانِ مہ و پروین (نثر)

۷۔ ذوقِ تماشا (نثر)

۸۔ تلاوتِ دِل (نغمیہ مجموعہ)

۹۔ اقبال بحضورِ اقبال (نثر)

اِنتسابُ

استادِ محترم
سیّد باقر علی شاہ (مرحُوم)
کے نام،

جو نابینا تھے لیکن اپنے ہر نابینا طالب علم کو
بینائی عطا کرتے تھے۔

پیش لفظ

کم و بیش پانچ برس گزرنے کے بعد "ذوقِ تماشا" کے تسلسل کے حوالے سے نابیناؤں کے مسائل پر ماہنامہ "سفید چھڑی" میں میں جو تجربات اداریوں کی صورت میں سپردِ قلم ہوئے انہیں ایک بار پھر مرتب کر کے نذرِ قارئین کر رہا ہوں۔ اگرچہ "ذوقِ تماشا" کو ابھی تک اُن اداروں میں پذیرائی حاصل نہیں ہو سکی جو نابیناؤں کی تعلیم و تربیت اور فلاح و بہبود کے لئے مصروفِ عمل ہیں۔ اس میں میری کوتاہی کا حصہ بھی ہو سکتا ہے لیکن سب سے بڑا حصہ اس علاقے کا ہے جس میں میں قیام پذیر ہوں جہاں ذرائع کا فقدان ہے اور جہاں سے بڑے مراکز تک رابطے کارِ محال ہیں۔ اِس شہر میں آپ جتنی بلندی سے چیخ لیجئے اِس کی بازگشت سے آپ کی اپنی سماعت تو متاثر ہو سکتی ہے لیکن

وہ چیخیں شاید اُن ایوانوں اور مراکز تک نہیں پہنچتیں جہاں پہنچنا موجودہ حالات میں انتہائی ضروری ہے۔ بہرکیف شاید اس طرح دِل کا بوجھ تو ہلکا ہو جاتا ہے اور پھر کیا عجب کہ کبھی یہ چیخیں قوتِ پرواز حاصل کر لیں اور وہاں پہنچ جائیں جہاں افراد کی قسمتیں تحریر ہوتی ہیں۔

مساعیٔ ذات خود مستحسن قرار دی گئی ہے۔ اِس لیئے جہاں تک قلم نے ساتھ دیا ہے کچھ ایسے مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے جو نابینا افراد کے لیئے سوہانِ رُوح بنے ہوئے ہیں جیساکہ بارہا عرض کیا گیا ہے کہ اصل ضرورت لوگوں میں تبدیلی کی ہے اور ہماری رائے میں قلم اِس ضمن میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

مجھے زندگی نے تجربات کی صُورت میں جو کچھ دیا ہے میں زندہ لوگوں کو نہایت دیانتداری سے لَوٹانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے نابینائی کے ہر رنگ کا قربت سے مشاہدہ کیا ہے۔ نابینائی کا ہر عذاب مجھے یُوں لگا کہ وہ مجھ پہ نازل ہوا ہو اور نابینائی کی ہر صُورت سے میں خُود بھی دوچار ہوا ہوں۔

اِس میں کلام نہیں کہ میری زندگی تمام تر مشکلات کے باوجود ناکامیوں کی داستان نہیں لیکن میں نے نابینا افراد میں اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ گزارا ہے اور بینا حضرات سے میرے روابط کسی طور بھی کمزور نہیں رہے ہیں۔ اِس لیئے معاشرے کے اِن

دونوں گروہوں کے نظریات اور خیالات سے مجھے ایک حد تک خاصی آگاہی ہے چنانچہ "دیدۂ دل" میں انہی تجربات اور احساسات کو میں نے اپنی فکر کا مرکزی نقطہ بنانے کی ہر ممکن سعی کی ہے۔

میں اس کتاب کی ترتیب اور اشاعت میں اپنے احباب سید نسیم الغنی، محمد اسحٰق کنڈ اور عزیز قریشی کا ممنونِ احسان ہوں۔

پروفیسر شیخ محمد اقبال
۱۴ اگست ۱۹۹۸

فہرست

۹

اکیسویں صدی کے تقاضے اور نابینائی

بیسویں صدی کا آخری عشرہ ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ اکیسویں صدی کے دروازے پر دستکوں کی آواز آہستہ آہستہ بلند ہونے لگی گویا لوگ کسی نئے دور میں داخل ہونے کے لئے بیتاب تھے۔ جیسے بیسویں صدی کو انہوں نے خدا خدا کر کے گزارا ہو اور اس کی بے کیفی اور یکسانیت سے تنگ آ گئے ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ تواتر سے انسان گھبرا جاتا ہے اور وہ نئے زمین و آسمان تلاش کرنے کی کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ وہ اس گنبد بے در سے مرنے کے بعد ہی رستگار ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی تمنا اور آرزو پر تو انسان کا حق ہے چاہے کچھ حاصل ہو یا نہ ہو۔ خواہشات کشاں کشاں اسے نئے ادوار کی جانب لئے جاتی دکھائی دیتی ہیں۔ سچ پوچھیے تو یہ ایک سراب تمنا ہے فریب آرزو ہے۔ انسان سدا نئے پن کے جنون میں گرفتار رہا ہے لیکن جب نئے پن سے بغلگیر ہوا تو لگا یہ تو وہی کچھ ہے جس سے فرار حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنا تن من دھن لٹا دیا تھا۔ جب اٹھارویں صدی، انیسویں صدی سے بغلگیر ہوئی تھی۔ تب بھی عالم انسانیت کے چہرے پر شادمانی کے آثار ہویدا تھے اور یہی صورت حال اس وقت پیدا ہوئی جب انیسویں صدی، بیسویں صدی سے معانقہ کرنے

لگی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم شب و روز ماہ و سال اور صدیوں کی حدود سے کہیں بلند تر اپنی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں لیکن تعینات کے اسیر ہونے کے بموجب ان حدود کو حقیقی سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اقبال نے کہا تھا۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصہ جدید و قدیم

ملٹن وقت کو ایک ندی قرار دیتا ہے۔ زمانہ ایک خالص دوران اور مرور ہے۔ ہمارا ذہن اپنی سہولت کی خاطر اس خالص زماں کو متواتر آنات میں تقسیم کر لیتا ہے تاکہ اس طرح حقیقت کی فعالیت کا تصور ممکن ہو سکے اور اس کی پیمائش کی جا سکے وگرنہ وقت ایک سیل بے کراں ہے ایک قوت محرکہ ہے ایک جوش و خروش ہے جو کائنات میں جاری و ساری ہے لیکن عوام الناس اس تسلسل حیات کے احساس سے مطلقاً عاری نظر آتے ہیں۔

لیکن چونکہ ہم اس عوام الناس کی دنیا ہی میں بس رہے ہیں اس لئے اس کے روز و شب سے اپنا تعلق استوار کرتے رہتے ہیں اور اس کے سالوں اور صدیوں کو حقیقی حدود ماننے لگتے ہیں۔ چنانچہ اکیسویں صدی کے آغاز سے پہلے ہی ہم اس کے بارے میں پرجوش اور متفکر ہو گئے ہیں بڑے بڑے منصوبے ترتیب دیے جا رہے ہیں۔ ہر حکومت اپنے عوام سے بڑے بڑے دل خوش کن وعدے کر رہی ہے۔ لوگ خوش ہیں کہ ان کی

زندگیوں میں ایک انقلاب پیدا ہونے والا ہے اور وہ کولرج اور شیلے کی طرح کسی Pantisocracy اور Millennium کے خواب دیکھنے لگے ہیں۔ ہمیں ان کے ان رنگین خوابوں کو مسمار کرنے کا تو کوئی حق حاصل نہیں لیکن ہم یہ ضرور عرض کر سکتے ہیں کہ اس قدر خواب ہی دیکھے جانے چاہییں کہ اگر آنکھ کھل جائے تو ہمارا جینا پہلے سے زیادہ اجیرن نہ ہو جائے۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آئندہ آنے والے سو برس بے پناہ تبدیلیاں لا سکتے ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ یہ تبدیلیاں مثبت ہوں گی یا منفی۔ لیکن تبدیلیوں سے انکار ممکن نہیں۔ آج سے سو سال پہلے انسان کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انسان نے مادی آسائشوں میں بے پناہ اضافہ کر لیا ہے اور اگر سو سال پہلے کا انسان جاگ اٹھے تو وہ انگشت بدنداں رہ جائے گا اور اسے یقین بھی نہیں آسکے گا کہ یہ وہی کرہ ارض ہے کہ جس میں وہ سانس لیتا تھا۔ یقیناً اکیسویں صدی کا سفر اسی شاہراہ پر آگے بڑھے گا جو انسان نے اختیار کر لی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اس سفر میں اسے کئی نئی پگڈنڈیاں بھی نظر آجائیں یا وہ کئی نئی شاہراہیں تراش لے۔

اکیسویں صدی کے تقاضے اور نابینائی کے حوالے سے ہم یہی توقع کر سکتے ہیں کہ انسانیت بے بصر حضرات کو زیادہ دیر نظر انداز نہیں کر سکے گی اور ان کے مسائل کا کوئی نہ کوئی ایسا حل ضرور تلاش کر لیا جائے

گا جہاں وہ اپنے بینا احباب کے ساتھ زندگی کی سہولتوں سے مساوی طور پر بہرہ ور ہو سکیں گے۔ اکیسویں صدی کا ایک دل خوش کن پہلو یہ بھی دکھائی دیتا ہے کہ اب سرد جنگ کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ بڑی طاقتوں کو اسلحہ کے انبار لگانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اب وہ اپنی تمام تر صلاحیتیں، بیماری، غربت اور افلاس کو دور کرنے میں صرف کر سکتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ایسا ہو تو زندگی سچ مچ مسکرانے لگے گی۔ اس کے لبوں پر مسرت و شادمانی کے گیت ہوں گے۔ یہ ممکن ہو گا کہ مہلک بیماریوں کا علاج تلاش کر لیا جائے اور اس طرح نابینائی سے بھی نجات ممکن ہو سکے۔ اگر بیسویں صدی نے Cornial Grafting کو ممکن بنا دیا ہے تو اکیسویں صدی Retinal detachment پر بھی قابو پا سکتی ہے اور ایسا ممکن ہے کہ ہر بے بصر بصارت کی نعمتوں سے فیض یاب ہو سکے۔ اکیسویں صدی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ معذوری اور بیماری کے خاتمے کے لئے اپنے تمام ذرائع وقف کر دے اور جب تک یہ ممکن نہ ہو۔ معذورین سے متعلق اپنے رویوں میں مثبت تبدیلی لائے۔ بیسویں صدی کا اختتام ہے۔ آج بھی کوئی بے بصر شاہراہوں پر بحفاظت سفر نہیں کر سکتا۔ وہ سفید چھڑی کے استعمال سے بھی خطرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا کیونکہ 90 فیصد افراد کو یہ معلوم ہی نہیں کہ سفید چھڑی نابیناؤں کے تحفظ کی علامت ہے اور شاہراہوں پر ان کے حقوق کی محافظ ہے۔ آج بھی وطن

عزیز میں کوئی نابینا Guide Dog کے ساتھ سفر نہیں کر سکتا کیونکہ اوسط ذہن اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ آج بھی اگر اس کے کشکول میں ملازمت کی نوید ڈال دی جاتی ہے تو یہ محض ثواب دارین حاصل کرنے کا ایک مؤثر طریقہ متصور ہوتا ہے کسی معذور کی مدد، احساس برتری سے کرنے کی بجائے ایک ذمہ داری تصور کر کے کی جانی چاہیے۔ اکیسویں صدی بڑی بشارتوں کی صدی متصور ہو رہی ہے اگر ایسا ہے تو نابینا حضرات بھی یہ توقع کر سکتے ہیں کہ انہیں ان کی بنیادی ضرورتیں فراہم کی جائیں گی۔ ان کے ہاتھوں میں سو سال پرانے بریل فریمز کی بجائے Opticon جیسی مشین ہو گی جو ہر تحریر پڑھنے میں ان کی مدد کرے گی وہ Cursweel جیسی ایجاد سے استفادہ کر سکیں گے اور اس طرح ہر کتاب وہ مشین کے ذریعے سننے کے قابل ہو جائیں گے۔ یورپ کی طرح پاکستان میں بھی ان کے لئے بریل میں روزنامے اور ہفت روزے شائع کرنے کا اہتمام کیا جائے گا۔ شہر شہر میں بریل پریس ہوں گے اور پھر جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اگر متمدن اور ترقی یافتہ اقوام کسی اور جنگی جنون کا شکار نہ ہوئیں تو دنیا کے کروڑوں بے بصر بینائی کی نعمت سے فیض یاب ہو سکیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اکیسویں صدی کے ثمرات سے فیض یاب ہوتے ہوئے ہر طاقتور اور کمزور، ہر امیر و غریب، ہر بیمار اور صحت مند کی ضرورتوں کو ملحوظ نظر رکھا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ امید بھی Utopia سے

کم نہ ہو لیکن یہ سچ ہے کہ اگر انسان جو بلند بانگ دعوے کرتا رہتا ہے اگر خلوص نیت سے عروس زندگی کی مشاطگی کرنے لگے تو یقیناً وہ کرہ ارض جنت بن جائے۔ خوشیوں کا دور دورہ ہو اور ظلم صفحہ ہستی سے مٹ جائے۔ کاش کہ ایسا ہو سکے۔

۱۵

نابینائی اور محبّت

وہ بھی کیا خوب دن تھے جب زندگی اپنے پورے جوبن پر تھی، آرزوئیں دل میں رقص کیا کرتی تھیں، تمنائیں اپنی رنگینیاں بکھیرتی تھیں۔ اس امر کے باوجود کہ آنکھیں رنگینیوں کو محسوس کرنے سے قاصر تھیں لیکن رنگینیاں تھیں کہ دل و دماغ میں اتری چلی جاتی تھیں لیکن دیکھنے والی آنکھیں محسوس کیا کرتی تھیں کہ نابینائی تو زندگی کی تنسیخ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیار بھرے انداز میں میرے ساتھی مجھ سے سوال کیا کرتے تھے کہ آپ شعر تو کہتے ہیں کیا کبھی آپ نے کسی سے محبت بھی کی ہے اور اس جملے میں ایک اور سوال پنہاں ہوتا تھا کہ کیا کوئی بھی بے بصر فرد محبت کی رعنائیوں اور رنگینیوں کو اپنے دل میں جذب کر سکتا ہے۔ روح سے محسوس کر سکتا ہے۔ میں اس سوال کا کچھ جواب دیتا اور کچھ شاید نہ دے پاتا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس طرح کے سوالات بڑھنے لگے تو پھر دل کی کیفیت کا لفظوں میں بیان کرنا بھی قدرے آسان ہونے لگا لیکن چونکہ یہ مسئلہ انفرادی مسئلہ نہیں بلکہ اس طرح کے سوالات کم و بیش ہر نابینا شخص سے کیے جاتے رہے ہیں اور کیے جاتے رہیں گے کیونکہ یہ بیچاری دنیا اکثر و بیشتر محبت کے جذبوں سے آشنا ہی نہیں ہوتی اور غالب

اکثریت اس خیال خام کا شکار ہوتی ہے کہ محبت کا تعلق بھی بینائی سے ہوتا ہے۔ ہم نے مانا کہ آنکھ حسن کے جلوے سمیٹنے میں اپنی مثال آپ ہے وہ جس طرح رنگ و نور سے اپنی جھولیاں بھرتی ہے اسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ نا ممکن ہے۔

شیکسپیئر کو پڑھیے تو "Love at first sight"
کی ایسی ایسی حکایات سامنے آئیں گی کہ آپ بے خود ہو جائیں گے۔ Orsino کی Olivia پر جب پہلی نظر پڑی تو زمین آسمان بن گئی Rosalind نے جب Orlando کو پہلی بار دیکھا تو اس کی زندگی میں محبت کا ایک سیل بے پناہ امڈ آیا۔ محبت کی پہلی نظر کے اس طرح کے واقعات سے شیکسپیئر کے ڈرامے لبریز ہیں۔ بلکہ جانے اس پہلی نظر نے کتنے ناول، کتنے افسانے اور کتنے شعر تخلیق کیے۔ لیکن محبت کا تعلق آنکھ سے نہیں بلکہ دل سے رہا ہے۔ آنکھ نے تو حسن کو دل تک صرف منتقل ہی کیا ہے لیکن دل، پاگل دل جانے اپنے لیے کتنے در وا کر لیتا ہے کتنے دریچے کھل جاتے ہیں اور محبت کی خوشبو، اس کی لطافت، اس کا لمس، اس کا احساس اس میں پیوست ہو جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حسن ہی سے محبت کے بہت
سے سرچشمے پھوٹتے ہیں لیکن حسن کہیں آواز میں متشکل ہوتا ہے تو کہیں

خوشبو کی شکل اختیار کر لیتا ہے کہیں حسین جذبوں کے پیکر میں ڈھل جاتا ہے تو کہیں قربتوں کی لذتوں میں آشکار ہوتا ہے۔ محبت کی رم جھم پورے جسم و جاں کو متاثر کرتی ہے۔ احساسات کے نغمے دل اور روح کی گہرائیوں سے پھوٹتے ہیں۔ کیٹس نے کہا تھا۔

"Heard melodies are sweet, but·
those unheard are sweeter."

جون ڈن محبت کرنے سے پہلے ہی اپنی محبوبہ کی جھلک محسوس کرنے کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ اس کا یہ تجربہ غیر منطقی سہی بلکہ اس میں شک نہیں کہ محبت کا تعلق کبھی آنکھ سے تادیر وابستہ نہیں ہوتا بلکہ آنکھ کا رہین منت ہی نہیں رہ سکتا۔ رنگ اور روپ نے جو کاری زخم دل و دماغ پر لگائے ہیں اس سے ہمارا ادب بھرا پڑا ہے۔ ظاہری حسن ڈھل جاتا ہے اور حسن ہی سے وابستہ محبت اپنی موت مر جاتی ہے لیکن وہ محبت جس کا تعلق احساس اور جذبے سے ہوتا ہے۔ وقت رنگ و روپ کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اور نکھرتی رہتی ہے۔ ہم اپنے محبوب کو جس قربت سے محسوس کرتے ہیں وہی محبت کا سرچشمہ ہے۔ محبت زندگی کے اسلوب کا نام ہے۔ محبت دکھ میں سکھ کی بادِ بہاری سے کم نہیں۔ زندگی کی رات میں صبحیں اس سے روشن ہوتی ہیں اور پھر کاروان حیات جاری و ساری ہو جاتا ہے۔

اس موضوع پر لکھتے جائیے کہتے جائیے اس کا کوئی اختتام نہ ہوا ہے اور نہ ہو گا۔ لیکن ایک بات ان مٹ حقیقت بن کر زندگی اور ادب میں جاری و ساری ہے کہ محبت کا تعلق جذبوں سے ہے اور جذبے بینائی کے محتاج نہیں بلکہ ان کا تعلق تو ذہنی ہم آہنگی سے ہوتا ہے جس سے وہ نغمے پھوٹتے ہیں جو زندگی کے شور و غوغے کو نیست و نابود کر دیتے ہیں۔ یہ جذبے ایسی روشنی ہیں جو تند ہواؤں میں گل نہیں ہوتی جو سدا روشن رہتی ہے اور تیرگی کے دامن کو تار تار کر دیتی ہے۔ بحمد اللہ یہ روشنی، یہ خلوص، یہ محبت، یہ جذبات بینائی کے محتاج نہیں۔

دینی مدارس اور نابینا افراد

اس میں کلام نہیں کہ دینی مدارس ہماری معاشرتی زندگی میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کا وجود شب حیات میں صبح امید سے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ مہ و مہر کی طرح ہماری راہوں کو تابناک بناتے ہیں اور ہمیں جینے کا اسلوب عطا کرتے ہیں۔ دراصل دینی مدارس نے جس طرح اشاعت اسلام میں گراں بہا خدمات سرانجام دیں وہ صرف انہی کا حصہ ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ جہاں جہاں اسلام کا نام لینے والے موجود ہیں ان کا تعلق کسی نہ کسی طرح دینی مدارس سے جڑتا دکھائی دیتا ہے۔ ہماری مساجد انہی کے دم سے آباد ہیں قال اللہ قَالَ الرَّسُولُ کی آوازیں انہیں سوتوں سے پھوٹی ہیں۔ تحریک پاکستان میں دینی مدارس کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔ یہ الگ بات کہ تمام دینی مدارس اس کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ جب علامہ اقبال نے برصغیر پاک وہند میں دینی مدارس کی صورت حال کا جائزہ لیا تو وہ قطعی طور پر مطمئن نہ تھے اس کا اظہار انہوں نے اپنے اشعار میں جا بجا کیا ہے۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ
اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا

موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات

علامہ نے محسوس کیا کہ ہمارے مدارس جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں اور اس طرح وہ اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ اسی طرح اقبال کے کلام میں ملا کے خلاف ایک شدید رد عمل دکھائی دیتا ہے اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس کا افق ذہنی وسیع نہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ دینی مدارس نے اپنے ملی و قومی فریضے کو بھی سمجھنا شروع کر دیا ہے اور تعمیر ملت کے لئے گراں بہا خدمات سرانجام دیں یہ ممکن ہے کہ ایسے مدارس کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکے جن کا کردار مثبت رہا ہے۔ لیکن ہماری نظر میں دینی مدارس کا مجموعی کردار کوئی اتنا حوصلہ شکن بھی نہیں رہا دراصل اس میں ان کا کوئی اتنا قصور بھی نہیں تھا کیونکہ خود ان مدارس میں تعینات اساتذہ کی تعلیم و تربیت کا کوئی اہتمام بھی نہیں تھا اور اکثر و بیشتر دینی تعلیم کو محض چند مباحث تک محدود کر دیا گیا تھا اور دین کو ضابطہ حیات کے طور پر تصور ہی نہیں کیا گیا تھا۔ بہر حال یہ ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس پر کھل کر بحث کرنے کی گنجائش ہے۔

ہمیں یہاں صرف یہ واضح کرنے کی کوشش کرنا ہے کہ دینی مدارس سے نابینا افراد کا بھی گہرا تعلق رہا ہے۔ بلکہ ان کی واحد تربیت گاہ اور پناہ گاہ دینی مدارس کو ہی گردانا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ عوام الناس ابھی تک کبھی یہ نہیں سمجھ پاتے ہیں کہ بے بصر حضرات کو

زندگی میں اپنے بینا ساتھیوں کی طرح زندگی کا اسلوب تراشنا چاہیے۔ نابیناؤں کے لئے دینی مدارس میں تربیت اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ کسی بینا شخص کے لئے ہمیں تخصیص پر اعتراض ہے کیونکہ بینا اور نابینا حضرات میں انسان ہونے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ بینا اور نابینا ایک ہی جیسے جیتے جاگتے سوچتے اور محسوس کرتے انسان ہیں یہ تصور کہ صرف نابینا ہی کو حافظ قرآن ہونا چاہیے۔ مدرسے سے منسلک ہونا چاہیے۔ دینی تعلیم حاصل کرنا چاہیے درست دکھائی نہیں دیتا یہ ٹھیک ہے کہ سب کچھ انتہائی ضروری ہے مگر یہ اتنا ہی ان کے لئے ضروری ہے جتنا کہ بینا حضرات کے لئے۔ دراصل ہماری قوم طبقاتی تقسیم میں بہت دلچسپی رکھتی ہے اور اس کی وجہ ہندو رسوم اور رواج ہیں جہاں برہمنیت کو بڑی اہمیت حاصل ہے دین اسلام میں تو ہر مسلمان مرد وزن بینا اور نابینا نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے لیکن ہندوانہ تصورات کے زیر اثر ہماری معاشرتی زندگی میں روحانی اقدار بری طرح متاثر ہوئی ہیں اور اسی صورت حال کے پیش نظر نابینا اور حافظ مترادف ہو کر رہ گئے ہیں ہر نابینا کو بلا تامل حافظ صاحب کہہ دیا جاتا ہے جو کہ انتہائی مضحکہ خیز صورتحال ہے جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں بے بصر حضرات کے لئے مواقع کی بہت کمی ہے اور اس لئے انہیں دینی مدارس سے ہی منسلک کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ دینی مدارس میں نابینا حضرات کس صورتحال

سے دوچار ہوتے ہیں۔ ہمیں وہ واقعات معلوم ہیں جو کہ تحریر کرتے ہوتے لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ مدارس میں جو ظالمانہ سلوک ان بے بصر بچوں پر روا رکھا جاتا ہے اس کی مثالیں Charlis Dickens کے ناول میں بھی کہیں کہیں ملتی ہیں۔ میرا تعلق بے بصر حضرات سے رہا ہے اور خاص طور پر ان حضرات سے جو اپنے مدارس میں زیر تعلیم رہے ہیں ان کی روداد سن کر رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ممکن ہے کہ ایسی صورت حال ہر مدرسے میں موجود نہ ہو لیکن اکثر و بیشتر نابینا حضرات ایسے واقعات پیش کرتے ہیں جن سے اس صورت حال کی تصدیق ہوتی ہے جب مجھے نظر آنا بند ہوا تو مجھے چند روز کے لئے ایک اسی طرح کے مدرسے میں ڈے سکالر کے طور پر داخل کرا دیا گیا۔ مجھے بریل نہیں آتی تھی اس لئے قرآن کو زبانی ہی حفظ کرتا تھا قاری صاحب نے ایک سینئر طالب علم کو کہہ دیا کہ وہ مجھے سبق پڑھایا کرے اس نے ایک دوبار سبق پڑھایا اور پھر مجھ سے توقع کی گئی کہ میں اسے یاد کر لوں گا لیکن ایسا بہت مشکل تھا پھر قاری صاحب کے سامنے پیش کیا گیا ابھی انہوں نے کچھ کہا بھی نہیں تھا کہ مجھے یوں لگا کہ جیسے جسم سے میری جان نکال لی جائے گی ایک خوف تھا جو مجھ پر طاری تھا لیکن چند روز کے بعد میرے والد نے مجھے وہاں سے ہٹا لیا اور ایک نابیناؤں کے سکول میں داخل کرا دیا اس لئے اس ضمن میں میرا تجربہ انتہائی محدود ہے لیکن ہمارے نابیناؤں کے لئے ادارے میں ایسے طلباء کی ایک بہت بڑی

تعداد موجود رہتی ہے جن کا تعلق ایسے اداروں سے رہا ہوتا ہے ان کے خیال میں مدرسوں کی صورت حال انتہائی افسوسناک ہے ایک مدرسے میں چند ایک نابینا اور بہت سے بینا طالب علم ہوتے ہیں نابینا طلباء کو الگ تھلگ رکھا جاتا ہے اور ان سے امتیازی سلوک برتا جاتا ہے جب میں نے ان طلباء سے دریافت کیا کہ یہ بات قرین قیاس محسوس نہیں ہوتی کیونکہ میں مختلف سکولوں اور کالجوں میں پڑھتا رہا ہوں اور وہاں بینا طلباء ہوتے ہیں جبکہ مدرسوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ بینا طلباء نابیناؤں کو کوئی مختلف چیز سمجھتے ہیں اور بات بات پر ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔

ایک نابینا طالب علم نے بتایا کہ جب مجھے ایک مدرسے میں داخل کرانے لے جایا گیا تو میرے والد سے مولوی صاحب نے کہا کہ دین کی خدمت کیلئے ناکارہ بچے کو لے آئے ہو سالم بچہ لاتے تو بات بھی تھی اس طالب علم نے بتایا کہ مولوی صاحب ان سے یہ بات نہایت حقارت سے کہہ رہے تھے اور اس سے میرا دل ٹوٹ گیا اس طرح بہت سے طلباء نے مجھے بتایا کہ دینی مدارس میں نابینا بچوں کو ہر وقت مدارس میں ہی رہنا ہوتا ہے انہیں گھر جانے کی بھی اجازت نہیں ہوتی کیونکہ ان کے خیال میں اس طرح بچے کی توجہ حفظ قرآن کی طرف نہیں رہتی میں نے اپنے ادارے کے بہت سے طلباء کو انٹرویو کیا اور مجھے بہت سے تلخ حقائق معلوم ہوتے حقیقت یہ ہے کہ بہت سے طلباء جو مدارس سے ہمارے نابیناؤں کے ادارے میں آتے

ہیں وہ مخصوص عادات کے حامل ہوتے ہیں نابینا بچوں کو داخل کرانے میں کوئی قباحت نہیں انہیں وہاں بینا حضرات کی طرح دینی علوم سیکھنا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں مروجہ علوم سکھانے کا بھی اہتمام کیا جانا چاہیے انہیں بریل سکھائی جانی چاہیے تاکہ وہ انگلیوں سے چھو کر ابھرے ہوئے حروف کو ذریعہ تعلیم بنا سکیں بریل میں قرآن و حدیث اور فقہ کی کتب تیار کی جا سکتی ہیں بریل میں قرآن مجید تو پہلے ہی دستیاب ہے ہمارے ادارے کے ایک بچے نے آڈیو کیسٹ کے ذریعے کوئی دو سال میں قرآن مجید حفظ کیا۔ ہمارے لئے یہ تجربہ انتہائی دل خوش کن ہے چنانچہ حفظ قرآن کیلئے آڈیو کیسٹ کو بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اگر نابینا طلباء کو دینی مدارس ہی میں رہنا ہو تو تب بھی کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ دینی مدارس جدید تعلیم کا اہتمام بھی کریں وگرنہ ہماری رائے میں نابینا بچوں کو نابیناؤں کے اداروں میں داخل کرایا جائے ایسے اداروں میں حفظ قرآن کا بھی پوری طرح اہتمام ہوتا ہے اور مروجہ علم و ہنر سکھانے کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ صورت حال کا نئے سرے سے تجزیہ کیا جائے تاکہ نابینا حضرات بھرپور سماجی اور معاشی زندگی گزار سکیں یہ امر بھی تعجب خیز ہے کہ وہی مذہبی ادارے جو نابینا بچوں کو حفظ قرآن کراتے ہیں انہیں امامت کے قابل ہی نہیں سمجھتے۔ یہ ممکن ہے کہ سب مدرسوں میں یہ صورتحال موجود نہ ہو لیکن ایسی مثالیں اکثر و بیشتر سامنے آتی ہیں جبکہ

نابیناؤں کو امامت کے فرائض سے الگ تھلگ رکھا گیا کیونکہ وہ بعض حضرات کی رائے میں اپنی صحت و صفائی کا خیال نہیں رکھ سکتے۔ یہ بھی ایک مفروضہ ہے جسے بہت سے دوسرے مفروضوں کی طرح باطل قرار دیا جانا چاہیے ہمارے نابینا بچوں کو عام بچوں کے مقابلے میں جدید تعلیم کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ ان کے پاس دیکھنے کی سہولت نہیں ہوتی اور وہ زندگی کی کتاب کو کم ہی پڑھ سکتے ہیں انہیں جو کچھ پڑھنا ہوتا ہے وہ کتابوں ہی سے پڑھتے ہیں چنانچہ ان کے لئے عام تعلیم بینا حضرات کے مقابلے میں کہیں زیادہ ضروری ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ رویوں میں خاطر خواہ تبدیلیاں ہوں گی اور نابینا حضرات کی زندگیوں میں بھی بہار آئے گی اور وہ ایک خوشحال، بھرپور اور توانا زندگی گزار سکیں گے

بار الٰہ ! ایک عمران خان کا سوال ہے

حاجت مند انسان کی نفسیات بھی بڑی عجیب و غریب ہوتی ہے اور بعض اوقات وہ ایسے کام کر گزرتا ہے جو اس نے کبھی نہیں کئے تھے اور خاص طور پر وہ معاشرہ جس میں ہم سانس لے رہے ہیں عجیب و غریب ذہنی رجحانات سے نمو پذیر ہوا ہے یہاں شخصیت پرستی، پیر پرستی، حاجات پرستی خواہشات پرستی جانے کون کون سی پرستشیں ہوتی رہتی ہیں اگر کسی پرستش کا فقدان ہے تو صرف اس کی پرستش کا جس کی پرستش ہم سب پر لازم ہے جو ہماری حاجات سنتا ہے۔ ہمارے خیال سے کہیں پہلے ہماری آرزوؤں کا ادراک رکھتا ہے لیکن کیا کیجیے ان روایات کا جو ہم میں پختہ تر ہو گئی ہیں ہماری انجمن کے تحت نابیناؤں کے لئے ایک ادارہ قائم ہے یہاں بہت سے نابینا افراد کسب علم و ہنر کرتے ہیں۔ بہت سے ملازمین ہیں اور جن کے قیام و طعام کے لئے ہمیں صاحب دل اور صاحب ایمان اشخاص سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ چند روز پہلے کی بات ہے کہ میں ادارے میں داخل ہوا تو مجھے کچھ نابینا افراد کی یہ آواز سنائی دی "بارِ الٰہ ! ایک عمران خان کا سوال ہے؟" مجھے پہلے تو ہنسی آئی لیکن پھر اچانک سنجیدہ ہو گیا کہیں سچ مچ ہمیں عمران خان کی ضرورت تو نہیں۔ مجھے یاد ہے

کہ آج سے کوئی پینتیس چالیس سال پہلے جب میں شیرانوالہ گیٹ لاہور میں نابینا سکول میں زیر تعلیم تھا اگرچہ وہ سکول حکومت کی تحویل میں تھا اور حکومت اپنے تیئں ہر سہولت مہیا کرتی تھی لیکن پھر بھی بہت سی مشکلات موجود تھیں سب سے بڑی مشکل ذہنوں میں یہ ہوتی تھی کہ یہاں سے فارغ ہو کر کیا بنے گا۔ نابیناؤں کے لئے ملازمتوں کا سرے سے کہیں تصور ہی نہ تھا۔ حکومت نے ملک میں دو ایک ادارے قائم کر رکھے تھے اور بس۔ اس وقت ہمارے ساتھی یہ دعا کرتے تھے "بارِ الٰہ کسی صدر اور وزیر اعظم کا کوئی بچہ بینائی سے محروم ہو جائے شاید اس طرح ان کی نظر کرم بے بصر حضرات پر پڑ جائے۔"

یہ دعا کوئی درست دعا نہ تھی حکم ہے کہ نیکی کی دعا کیا کرو بھلائی مانگا کرو لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا کہ حاجت مند انسان کی نفسیات بہت عجیب ہوتی ہے۔ کچھ اس طرح ہوا کہ ۱۹۷۷ء میں ملک میں مارشل لاء کا نفاذ ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ جنرل ضیاء صاحب کی اپنی بیٹی معذور ہے ان کی بے بہا عنایات معذورین پر ہوتیں۔ ممکن ہے کہ ان کی بچی معذور نہ بھی ہوتی تب بھی وہ فلاح و بہبود کے اسی طرح کام کرتے لیکن معذورین کا خیال ہے کہ ان کی بچی کا معذور ہونا یقیناً فلاح معذورین میں سنگ میل ثابت ہوا۔ بہر کیف زندگی کے کام چلتے رہتے ہیں اور وہ سب کا پرسان حال ہے ایسے اسباب فراہم کرتا رہتا ہے جس سے دکھ کی طویل راتیں صبح

روشن میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

نابیناؤں کے منہ سے یہ دعا سن کر میرے ذہن میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہم سب جانتے ہیں کہ عمران خان ملک کے مایہ ناز کھلاڑی رہے ہیں اور قوم انہیں اسی حوالے سے جانتی ہے۔ انہوں نے بارہا ملک کے لئے کرکٹ کے میدان میں فتوحات کے جھنڈے گاڑے ہیں ذرائع ابلاغ نے ان کی تعریف و توصیف میں کبھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا وہ اب بھی لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں ان کی والدہ کا کینسر میں مبتلا ہونا تھا کہ انہیں یہ خیال آیا کہ اس مرض کے خلاف جہاد کیا جائے اور انہوں نے عوام سے اپیل کی اور "جھولی پھیلاؤ" تحریک کا آغاز کیا اور پھر چشم زدن میں عمران ہی کی نہیں بلکہ ان سب کی جھولیاں بھر گئیں جنہوں نے عمران خان کا نام لیا عوام نے یہ نہیں دیکھا کہ لینے والا کون ہے صرف یہی کافی تھا کہ اس کے ہونٹوں پر عمران خان کا نام تھا۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں اور ہر شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والے لوگ میدان میں نکل آئے۔ خواتین نے اپنے زیورات تک نذر عمران کئے۔ سوال یہ ہے کیا یہ کینسر کے لئے کیا گیا یا کہ عمران کے لئے۔ کیا لوگوں کو کینسر کی تباہ کاریوں کا احساس ہوا یا انہیں عمران خان کی آواز کی حلاوت نے اپنا گرویدہ بنا لیا انہیں عمران خان سے زیادہ محبت تھی کہ کینسر سے زیادہ نفرت، وہ کرکٹ سے زیادہ محبت کرتے تھے یا کرکٹر سے انہیں

عمران کھلاڑی زیادہ پسند تھا یا عمران سماجی کارکن۔ بہر حال شوکت میموریل ہسپتال معرض وجود میں آگیا۔

یہ لمحہ فکریہ ہے ملک میں بہت سی مہلک بیماریاں اور بھی موجود ہیں ملک میں بہت سی دلسوز آوازیں اور بھی بلند ہوتی ہیں ملک میں اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے لئے اور بھی جھولیاں پھیلتی ہیں کیا عوام کو شخصیات سے دلچسپی ہوتی ہے یا مقصد سے۔ ابھی اس سوال کا جواب ملنا باقی ہے۔ ایسا پاکستان ہی میں نہیں ہوا جب مائیکل جیکسن میدان عمل میں آیا اور اس نے عوام الناس سے اپیل کی تو اس کے لئے تجوریوں کے منہ کھل گئے اگر کسی کھلاڑی نے الیکشن میں حصہ لیا یہ جانے بغیر کہ سیاست اور کھیل میں کتنا تعلق ہے انہیں وزیر چن لیا گیا۔ کسی ایکٹر کو وزیر اعلیٰ کے منصب پر فائز کر دیا گیا۔ بہر کیف یہ تو قوموں کے مزاج کی بات ہے لیکن مزاج بدلنے چاہییں۔ صرف کھلاڑی، موسیقار اور اداکار ہی امانت داری کا سرچشمہ نہیں ہوتے ممکن ہے کچھ اور لوگ بھی ہوں جن کا دامن پاک ہو جن کی آوازمیں صداقت ہو جن کے جذبے میں خلوص۔ لیکن قوم کے پاس اتنا وقت کہاں، افراد کے پاس اتنی فرصت کہاں۔

پاکستان ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ کے مقام کو ہی لیجیے ملک میں پندرہ لاکھ بے بصر افراد موجود ہیں وہ افراد جو کام و ہنر حاصل نہیں کر

پاتے ان کی حالت کسی کینسر زدہ مریض سے کم تکلیف زدہ نہیں۔ کینسر زدہ مریض کے دکھ کے دن تو نسبتاً کم ہوتے ہیں مگر بے علم اور بے ہنر نابینا کی دکھ کی راتیں. بہت طویل ہوتی ہیں جن کی کوئی صبح نہیں ہوتی اس مقصد کو آگے بڑھانے کے لئے میں اور میرے ساتھی دن رات محو عمل ہیں۔ میں خود آٹھ سال کی عمر سے بے بصر ہوں میرے دو بھائی اور ایک بہن بھی بینائی سے محروم ہیں میں نے جس خلوص نیت سے کام کیا ہے اس کا اندازہ میرے خدا کے سوا اور کوئی نہیں لگا سکتا کیونکہ کسی کے پاس اتنی فرصت کہاں لیکن کتنے ہیں جنہوں نے نابینائی کے کینسر کو ختم کرنے کے لئے میری اور میرے ساتھیوں کی "جھولی پھیلاؤ" تحریک کا ساتھ دیا ہو یہ سچ ہے کہ ہمارا ادارہ جس پر 45 ہزار روپے ماہانہ اٹھتے ہیں عوام کی مدد سے ہی چل رہا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ یہ مسئلہ جتنا بڑا ہے اس پر تو کروڑوں بلکہ اربوں روپے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہمیں بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری آواز ابھی بلند نہیں ہوئی یا شاید اس میں تاثیر پیدا نہیں ہوتی ہم عوام الناس سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ آئیں اور ہمارے حسابات ملاحظہ کریں۔ ہماری کارکردگی دیکھیں لیکن کوئی ایک کان صاحب دل اس اپیل پر دھرتا ہے ایسے میں مجھے یہ لگتا ہے کہ ہمارے نابینا ساتھیوں کی یہ دعا "بار الہ ایک عمران خان کا سوال ہے" کچھ اتنی غلط بھی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ عمران خان کو اپنے مشن میں کامیاب کرے لیکن وہ لوگ جو عمران

خان نہیں ان کی طرف توجہ دینا بھی قوم کا مذہبی اور اخلاقی فرض ہے اور اتنا وقت نکالنا ان کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ کم از کم وہ یہ تو دیکھ لیں کہ ہماری راہیں صحیح ہیں کہ غلط۔ کیونکہ ہم عمران خان نہیں کہ یہ سب کچھ جانے بغیر عوام کی رگ سخاوت پھڑک اٹھے گی لیکن ہمیں ایک اطمینان ضرور ہے کہ ہم۔ بہر حال ابھی ہمت نہیں ہارے ابھی ہمارے حوصلے جواں ہیں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فلاح کی راہ۔ بہت دشوار گزار سہی مگر تسکین قلب کا سبب بنتی ہے یہ راہ روشنیوں کے شہر کو جاتی ہے خوشبوؤں کی بستیوں میں داخل ہوتی ہے اور رنگوں کے جزیرے دریافت کر لیتی ہے۔

جزوی نابینائی

کشت بے بصری میں آزمائش و ابتلا کی جانے کتنی فصلیں لہلہاتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ نابینائی کے لق و دق صحرا میں جانے کتنے ہیں جو لقمہ سفر ہو جاتے ہیں بسا اوقات اس کی راتوں میں نہ کوئی چاند دمکتا ہے نہ کوئی ستارہ، سحر کی جھولی کرنوں کو ترستی رہتی ہے اور یوں زندگی کی شام ہو جاتی ہے لیکن درد و آلام کے اس سفر میں اگر کوئی خضر راہ دستیاب ہو جائے تو سفر کی صعوبتیں قدرے کم ہو جاتی ہیں۔ اگر کہیں راہنمائی کی شمعیں فروزاں ہوں تو شب تاریک بقعہ نور بن جاتی ہے کہیں محبت کی کرنیں، تعاون کے پھول اور ہمدردی کے کنول دکھائی دیں تو زندگی کی خالی جھولی لبریز ہو جاتی ہے اور زندگی ہنسنے مسکرانے لگتی ہے۔

اسی اٹل حقیقت کے پیش نظر پاکستان ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ پاکستان میں اور ورلڈ بلائنڈ یونین تمام اکناف عالم میں کبھی عصائے موسوی کی صورت میں دکھائی دیتی ہیں اور کبھی شجر سایہ دار بنتی ہیں، کبھی جھلستی راہوں میں آنچل کی طرح لہراتی ہیں اور کبھی بادل کی طرح رفیق راہ بنتی ہیں اس ملکی اور عالمی تحریک کا منشا یہ ہے کہ نابیناؤں کی صلاحیتوں کو ضائع نہ ہونے دیا جائے اور انہیں اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ

وقار اور عزت کی زندگی گزار سکیں۔ لیکن ہمارے خیال میں نابینائی کا ایک پہلو ایسا ہے کہ جس پر اول تو توجہ ہوتی ہی نہیں اگر ہوتی بھی ہے تو نہ ہونے کے برابر۔ نابینائی کا یہ پہلو جزوی نابینائی ہے۔

ویسے تو ہماری رائے میں جزوی نابینائی عالم گیر مظہر ہے وہ دنیا جس میں ہر طرف خاک اڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جس میں متوازن غذائیت کا فقدان ہے۔ جہاں طبی سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں اور صحت کے اصولوں سے مطلقاً ناآگہی کا اندوہ ناک مظاہرہ ہوتا رہتا ہے اس میں جزوی نابینائی کا عام ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں بالخصوص تیسری دنیا میں۔ جہاں یہ مسائل انتہائی افسوس ناک صورت حال اختیار کر چکے ہیں۔ ہماری رائے میں ہمارے ملک میں کوئی 10 فیصد اشخاص ہوں گے جو مکمل بینائی سے بہرہ یاب ہوں گے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ ہر تیسرا طالب علم بینائی کے تحفظ کا چشمہ لگائے ہوئے محو مطالعہ ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو ذرا سی بینائی کے استعمال سے سردرد کرنے لگتا ہے آنکھوں سے پانی جاری ہو جاتا ہے اور چکر آنے لگتے ہیں۔ یہ علامتیں طبی حوالے سے بینائی کی کمزوری کی غمازی کرتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ چالیس سال کی عمر کے بعد بینائی کی کمی کا عارضہ ایک وبا کی صورت اختیار کر گیا ہے جس کی بہت سی وجوہات ہیں جن کا جزوی ذکر کیا جا چکا ہے۔

وہ لوگ جو نابیناؤں کے لئے اداروں میں زیر تعلیم ہیں

ان میں بڑی تعداد جزوی نابیناؤں کی ہے۔ ایسے حضرات کا عام زندگی میں المیہ یہ ہے کہ نہ تو انہیں نابینا تصور کیا جاتا ہے اور نہ بینا۔ "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن" کے مصداق یہ حضرات عجیب کش مکش کا شکار ہوتے ہیں اور بہت سے حضرات عام اداروں میں تعلیم پا رہے ہوتے ہیں بلیک بورڈ پر لکھی ہوئی کوئی چیز کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ کتب خوانی بھی ان کے لئے ایک بہت بڑا مسئلہ ہوتا ہے لیکن ایسے حضرات کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ ان کی بینائی بہت کمزور ہے۔ اگر وہ ایسا مان لیں تو عام زندگی میں ان کے ساتھ امتیازی سلوک برتا جائے گا انہیں معذور تصور کیا جائے گا اور وہ معذور کہلوانا پسند نہیں کریں گے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ یہ بصری کمزوری کو گناہ کی طرح چھپاتے پھرتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کسی کو معلوم ہو جائے اور یہ بدنام زمانہ ہو جائیں۔ ایسے حضرات کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کی جرات بھی نہیں کرتے اور اس طرح حفاظتی تدابیر سے مکمل طور پر نا آشنا رہتے ہیں۔ میرے ایک دوست ہیں جنہیں دن میں بہت کم دکھائی دیتا ہے اور شام کے وقت کم و بیش کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا مگر وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں اگر وہ مانتے بھی ہیں تو بتانے کے لئے تیار نہیں کیونکہ انہیں

خدشہ ہے کہ انہیں اس طرح ملازمت سے سبکدوش کر دیا جائے گا یا پھر معذور سمجھ کر بے اعتنائی کا نشانہ بنا لیا جائے گا۔ یہ کیفیت صرف انہی کی نہیں ہے بلکہ ایسے حضرات کی ایک بہت بڑی تعداد اسی جانکاہ تجربے سے گزر رہی ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ ان مسائل کے حل کے لئے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر حکومتیں اور NGOs اپنا کردار ادا کریں۔ اگر بینائی کمزور ہو تو اس کے تحفظ کا اہتمام کیا جائے۔ اور اسے مزید بگڑنے سے بچایا جائے۔ سکولوں میں پڑھنے والے جزوی نابیناؤں کے لئے Large Type Books اور Magnifiers کا استعمال کیا جائے۔ انہیں بلیک بورڈ کے قریب تر بٹھایا جائے۔ انہیں آڈیو کیسٹس کے استعمال کی اجازت دی جائے اور بریل سکھانے کا اہتمام کیا جائے تاکہ نظر کا استعمال کم سے کم ہو۔ تعلیمی اداروں اور دفاتر میں ہر سال کے بعد بینائی کا طبی معائنہ کرایا جائے اور جزوی نابیناؤں کی ملازمت کا تحفظ کیا جائے۔ اگر جزوی نابینا، بیناؤں کا سوانگ رچا کر مدرسوں اور دفتروں میں موجود رہے تو جزوی نابینائی کا عارضہ شدید تر ہوتا جائے گا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسی فضا قائم کی جائے کہ کسی کو یہ اعتراف کرنے میں تامل نہ ہو کہ اس کی بینائی کتنی کمزور ہے۔ کیونکہ ضروری Gadgets کی دستیابی کے بعد جزوی نابینا زیادہ مستعدی سے کام کر سکتے ہیں۔ مزید برآں ایسے اقدام بھی کیے

جائیں جس سے بینائی کا تحفظ کیا جا سکے۔ متوازن خوراک کا اہتمام ہو اور مستند ڈاکٹرز کی سہولیات سرکاری اور غیر سرکاری طور پر مہیا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ تیسری دنیا کو جو جان لیوا عارضے لاحق ہیں ان میں سے ایک عارضہ حقیقت کو نہ ماننے کا عارضہ بھی ہے۔ اکثر و بیشتر حقائق سے آنکھیں بند کر لی جاتی ہیں۔ بالکل اس کبوتر کی طرح جو بلی کے خوف سے آنکھیں موند لیتا ہے اور اس طرح اس کا شکار ہو جاتا ہے حالانکہ وہ سوچ رہا ہوتا ہے کہ وہ بچ جائے گا۔ اصل مسئلہ بلی کو نہ دیکھنے کا نہیں ہے بلکہ اس کی حقیقت کو تسلیم کرنے کا ہے۔ کاش کہ ہم حقائق کو ماننے لگیں۔ سچ بولنے لگیں۔ سچ سننے لگیں اور برداشت کرنے لگیں۔ اس طرح جزوی نابینائی کا ہی نہیں بلکہ جزوی انسانیت کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور ہم توانا اور بھرپور زندگی گزارنے لگیں گے۔ جانے وہ کون سی صدی ہو گی؟ وہ کون سی زمین ہو گی؟ کون سا آسمان ہو گا؟ وہاں کے باسی کیسے ہوں گے؟ جو حقیقت سے آنکھیں چار کر سکیں گے۔

اشخاص کی شناخت اور نابینائی

ہر لحظہ بدلتے اس دور میں جو شکست و ریخت کا عمل جاری ہے اس کے تصور ہی سے رواں رواں کانپ اٹھتا ہے۔ شناختیں گم ہوتی جاتی ہیں کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ چہروں پر نقاب ہیں۔ جانے کتنے نقاب۔ یوں تو سولہویں صدی کے نابغہ، شیکسپیئر کے ایک کردار ہیملٹ نے کہہ دیا تھا۔

"One may smile and smile but be a villain."

لیکن ان چہروں کے مسخ ہونے کا ڈرامہ جس انداز سے دور حاضر میں سٹیج کیا جارہا ہے اس کی مثال اس سے پہلے کچھ کم ہی ملتی تھی کسی کو پہچاننا، جاننا اور اس کے بارے میں رائے قائم کرنا جوئے شیر کا لانا ہے۔ لیکن پھر بھی معاشرے نے جو شناختیں مقرر کر دی ہیں ان پر اعتبار کرنا ہی پڑتا ہے اور پھر اس وقت ہمارا یہ موضوع ہے بھی نہیں۔ ہمارا موضوع ظاہری شناخت ہے یعنی یہ کہ کسی شخص کو پہچان لینا دوڑ دھوپ کے اس دور میں اکثر یہ بھی ممکن نہیں وہ اشخاص جو سو فیصد بینائی رکھتے ہیں وہ بھی تیقن سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ جن اشخاص کو انہوں نے ایک دو بار دیکھا ہو وہ انہیں کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد فی الفور پہچان لیں گے۔ اکثر یہ دیکھنے میں

آیا ہے کہ کچھ مدت کے بعد چہرے کچھ اس طرح متغیر ہوتے ہیں کہ آمنے سامنے کھڑے دوست بھی ایک دوسرے کو پہچان نہیں پاتے اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ جدید دور کے تقاضوں نے انسان سے ذہنی سکون چھین لیا ہے اور وہ اس طرح کھویا کھویا رہتا ہے کہ کبھی کبھی اسے اپنی بھی شناخت نہیں ہو پاتی۔

آپ شاید نہ مانیں لیکن یہ سچا واقعہ ہے کہ میرے ایک مرحوم دوست جو ایم اے انگلش میں مجھ سے راہنمائی لیتے رہے امتحان کے دوران انہوں نے پریشانی میں اپنا نام عبدالغفور کی بجائے محمد شفیع لکھ

دیا جب انہوں نے مجھے یہ واقعہ سنایا تو میں بڑا حیران ہوا لیکن بعد کے تجربات نے ثابت کیا کہ زندگی میں اس قسم کا نسیان کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ چنانچہ اس دور آشوب میں کسی اور کو بھول جانا کسی کا نام یاد نہ رہنا تعجب کا سبب نہیں ہونا چاہیے لیکن تعجب خیز امر یہ ہے کہ جب یہ مسئلہ بے بصر حضرات کے حوالے سے سامنے آتا ہے تو اس کو اس کے صحیح تناظر میں نہیں دیکھا جاتا مثلاً کوئی صاحب اپنے نابینا دوست کو ملتے ہیں اور چپکے سے ان کے ہاتھ پکڑ لیتے ہیں اور توقع یہ کرتے ہیں کہ ان کا نابینا دوست محض چھو کر ان کی شناخت کر لے گا دیکھنے میں آتا ہے کہ پھر نابینا دوست اس کے جسم کو چھوتا ہے بازوؤں کو ٹٹولتا ہے اور پھر اندازے سے

بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ "آپ امجد ہیں نا" لیکن وہ خاموش رہتا ہے کیونکہ وہ امجد تو نہیں محمود ہے۔ پھر وہ نابینا کسی نہ کسی طور پر اسے پہچان لیتا ہے یا شرمندگی کا اظہار کرتا ہے اور بینا شخص کھلکھلا کر اپنا نام بتاتا ہے۔ ذرا سوچیے نابیناؤں کے لئے یہ صورت حال کس قدر تکلیف دہ ہے۔

بعض نابیناؤں کو چھونے کی بہت عادت ہوتی ہے
کیونکہ انہیں چھو کر شناخت کرنا ہوتی ہے اور وہ اس میں خاصے ماہر ہوتے ہیں اول تو یہ طریقہ کار ہمارے نزدیک خاصا مضحکہ خیز ہے اور پھر ہر ایک نابینا کو ایسی عادت نہیں ہوتی اور نہ ہونی چاہیے اور پھر وہ نابینا حضرات جو اپنے دوست کو چھو کر پہچان لیتے ہیں وہ اشخاص ہوتے ہیں جن کے جاننے والوں کی تعداد بہت ہی کم ہوتی ہے جنہیں کبھی کبھی کسی سے ملنا ہوتا ہے ان کا دائرہ اثر خاصا محدود ہوتا ہے لیکن اگر کوئی نابینا بہت مصروف زندگی گزار رہا ہو اور اسے دن میں سینکڑوں اشخاص سے ملنا ہو اور پھر اسے چھو کر پرکھنے کی نہ عادت ہو اور نہ فرصت ہو تو سوچیے یہ مرحلہ کس قدر مشکل ہو جاتا ہے اور نابینا شخص کو کتنی شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے۔ میرا یہی عالم ہے اور ویسے ہی میری یادداشت بھی کچھ اتنی اچھی نہیں کیونکہ میری یادداشت پر جانے خیالات کی کتنی افواج یلغار کرتی رہتی ہیں کتنے قافلے ہیں جو پڑاؤ ڈالتے ہیں یادداشت کی شاہراہ پر جانے کون کون گزرتا ہے ایسے میں کسی

دوست کی مذکورہ انداز میں شناخت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

چلیے اگر کوئی شخص بول کر بھی کہے کہ "مجھے پہچانیے میں کون ہوں؟" تب بھی یہ کام خاصا دشوار ہوتا ہے آوازیں بسا اوقات ایک دوسرے سے اتنی مماثل ہوتی ہیں کہ ان کی شناخت کوئی غیر معمولی ذہن ہی کر سکتا ہے یا پھر ایسا ذہن جس کے پاس غیر معمولی فرصت ہو۔

سوچیے اگر اندھیرا ہو اور کوئی دروازے کے اس پار سے آپ کو بلا رہا ہو تو آپ کے لئے پہچاننا اسی وقت ممکن ہو گا جب کہ آپ اس شخص کی آواز سے پوری طرح واقف ہوں اسی طرح ٹیلیفون پر پہچاننا بھی خاصا دشوار ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ آواز سے شناخت کرنا خاصا دشوار عمل ہے۔ ہمارے احباب ہیں کہ اس پر مصر ہوتے ہیں گویا بینائی چھن جانے کے بعد کوئی غیر معمولی طاقت کسی شخص کے ہاتھ لگ جاتی ہے جس کی مدد سے وہ علم غیب سے واقف ہو جاتا ہے۔ ایک مہربان تھے میں ان کی بڑی قدر کرتا تھا لیکن انہیں ملے ہوئے کوئی دس سال ہو گئے تھے وہ مجھے کالج میں ملے۔ انہوں نے مجھے سلام کیا اور کہا کہ مجھے پہچانو تو میں پہچان نہیں سکا۔ وہ بڑی محبت سے مجھ سے گلے ملے اور فرمانے لگے کہ "اب آپ پہچان لیں گے۔" لیکن میں پھر بھی پہچان نہیں سکا اور اس سارے عمل کے دوران کچھ اس طرح پریشان سا ہو گیا کہ

انہوں نے جب اپنا نام بتایا تب بھی میں انہیں پہچان نہ پایا۔ لیکن ان کے رخصت ہونے کے پانچ منٹ بعد مجھے ان کے بارے میں سب کچھ یاد آگیا مگر اس وقت میں سوائے افسوس کے کیا کر سکتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ نام بھی بھول جاتے ہیں آپ سے کتنے احباب ملتے ہیں جن کے نام آپ کی زبان پر ہوتے ہیں لیکن ایک عرصے کے بعد جب آپ انہیں دیکھتے ہیں تو ان کا نام بھی بھول چکے ہوتے ہیں محض شکل سے پہچان کر بڑی محبت سے گفتگو کرتے ہیں لیکن جب ان کا نام لینا پڑے تو ایسا نہیں کر پاتے۔ اب ذرا سوچیے کہ ایک نابینا شخص جس کا انحصار محض آواز پر ہوتا ہے اس کے لئے آپ کی شناخت کتنی مشکل ہوگی اس لئے ہماری دردمندانہ گزارش یہ ہے کہ اپنے نابینا دوست کو آزمائش میں مت ڈالیے۔ شرمندہ مت کیجیے اپنا نام اور اپنا حوالہ نہایت محبت سے بتائیے۔ وہ آپ کو پہچان لے گا اور آپ کے جذبات کا جواب محبت سے دے گا۔ وہ صرف بینائی سے محروم ہے مگر محسوس کرنے والا دل محبت سے لبریز روح اس کے پاس موجود ہوتی ہے وہ دوستی کے تقاضوں سے اسی قدر واقف ہوتا ہے جس قدر کہ اس کے بینا ساتھی۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ جہاں ہم نابیناؤں سے متعلق رویوں کی تبدیلی کی بات کرتے ہیں وہاں یہ رویہ بھی یکسر تبدیل ہونا چاہیے۔ اور یہ تصور ختم ہو جانا

چاہیے کہ بینائی کا متبادل کوئی غیر معمولی ذہن ہوتا ہے صرف فرق یہ ہوتا ہے کہ ایک نابینا شخص اپنی قوت حافظہ اور قوت لامسہ پر زیادہ انحصار کرتا ہے اس لئے یہ حسیات کسی قدر تیز ہو جاتی ہیں لیکن جو شخص بینا معاشرے کے درمیان بھرپور زندگی گزار رہا ہوتا ہے انہی کی طرح لکھ پڑھ سکتا ہے اس کے احباب بینا حضرات کی طرح ہر وقت اس سے ملتے جلتے رہتے ہیں اسے ٹٹولنے اور چھونے کی عادت نہیں ہوتی۔ اس سے یہ تقاضا کرنا کہ وہ محض ٹٹول کر آپ کی شناخت کر سکتا ہے قرین انصاف نہیں۔ ہماری رائے میں نابصر حضرات کو عام اشخاص کی طرح تصور کیا جانا چاہیے۔ صرف یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ بینا حضرات کے مقابلے میں اس کی مشکلات قدرے زیادہ ہیں اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ اسے نارمل زندگی گزارنے میں اس کی مدد کی جائے اور اسے کہیں یہ احساس نہ ہونے دیا جائے کہ وہ اپنے ساتھیوں سے کسی طرح مختلف ہے یا مافوق الفطری ذہن کا مالک ہے۔ اگر صحت مند رویے رواج پا جائیں تو بصارت کے بغیر بھی زندگی خوشگوار ہو سکتی ہے آسان ہو سکتی ہے اتنی ہی خوشگوار اور آسان جتنی کہ کسی بینا شخص کی۔

نابینا افراد اور ان کے فرائض

پس ماندہ اقوام کو جہاں بہت سے عارضے لاحق ہیں ان میں سے ایک عارضہ حقوق ہی حقوق پر زور دینے کا بھی ہے۔ مجھے اس سے انکار تو نہیں کہ حقوق کا شعور اقوام کے زندہ ہونے کی دلیل ہے اور جنہیں یہ شعور حاصل نہیں انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکا جاتا ہے لیکن اگر یہ صورت حال جنون کی شکل اختیار کر لے تو خرابی کی صورت یقیناً پیدا ہو جاتی ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ وہ ممالک جو ابھی تگ و تاز حیات میں نسبتاً پیچھے رہ گئے ہیں۔ جنہیں زندگی کی بنیادی ضرورتیں تک حاصل نہیں وہ ہمہ وقت حقوق کے حصول کی باتیں کرتے رہتے ہیں "مجھے یہ چاہیے" "یہ میرا حق ہے" "میرے حقوق کیوں نہیں دیے جاتے" "میرے حقوق غصب کئے جا رہے ہیں" اور پھر یہ نعرے اجتماعی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور سڑکیں گلی کوچے اور ایوان اس طرح کے نعروں سے گونجنے لگتے ہیں لیکن اگر تاریخ ملل کا مطالعہ کیا جائے تو یہ امر اظہر من الشمس ہو جائے کہ زندگی میں ترقی انہی اقوام نے کی ہے جنہوں نے حقوق کے ساتھ فرائض کی بات بھی کی اپنے پیارے وطن پاکستان ہی کو لے لیجیے یہاں پر ہر سیاسی اور غیر سیاسی تنظیم حقوق کی بات کرتی ہے لیکن ابھی کوئی ایسی تنظیم

بننا باقی ہے جو عوام الناس کی توجہ فرائض کی طرف دلاتے اور جو یہ بتائے کہ حقوق فرائض کے بغیر محض دیوانے کی بڑ ہوتے ہیں۔ علم سیاسیات کے طالبعلم جانتے ہیں کہ ایک فرد کا حق دوسرے کا فرض ہوتا ہے اگر فرض کی ادائیگی نہ ہوگی تو کسی کے حق کی پاسداری بھی ناممکن ہے۔ ونسٹن چرچل (Winston Churchill) نے کہا تھا "The price of greatness is responsibility" اور اسی طرح آسکر وائلڈ (Oscar Wilde) نے بڑی خوبصورتی سے اپنی رائے کا اظہار کچھ اس طرح کیا۔ "Duty is what one expects from others" حقیقت یہ ہے کہ فرائض کی ادائیگی بقائے حیات کے لئے ناگزیر ہے زندگی میں ارتقاء کا تصور ہی دھندلا پڑ جائے گا اگر فرائض کا احساس دلوں سے کافور ہونے لگے۔ ہم کسی بھی منصب پر متعین ہوں، کسی شعبہ حیات میں کارپرداز ہوں۔ ہمارا اولین احساس یہ ہونا چاہیے کہ ہم نے اپنا فرض منصبی ادا کیا ہے یا نہیں۔ ایک مفکر نے انگلینڈ کے بارے میں کہا تھا۔ "England expects every man to do his duty" اسی طرح ہم ہر پاکستانی سے اس کے فرائض کی ادائیگی کی توقع کر سکتے ہیں اور کرنے میں کماحقہ حق بجانب ہیں۔ Booker T. Washington کے مطابق "Few things help an

individual more than to place responsibility upon himself" حقیقت یہ ہے کہ Roy L Smith کے مطابق "The ability to accept responsibility is the measure of man" یعنی فرض کا احساس ہی انسان کے قد و قامت کا غماز ہوتا ہے۔

شو مئ قسمت سے پاکستان کا معاشرہ بڑی حد تک فرائض سے اجتناب کے عارضے میں مبتلا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہاں حقوق کو کسی نہ کسی طریقے سے سلب کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ بایں ہمہ یہ تسلیم کیا جانا چاہیے کہ اگر فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کا مظاہرہ کیا جائے گا تو حقوق کی صبح روشن کبھی نمودار نہ ہوگی، گلشن حیات میں ترقی و ارتقاء کے گلہائے رنگ و آہنگ کبھی اپنی بہاریں نہیں دکھا سکیں گے، انسانی آرزوؤں کے چمن کبھی اپنی نکہتیں نہیں بکھیر سکیں گے اور انسان کے آگے بڑھنے کی خواہش، ترقی کی تمنا اور خوشحال ہونے کی آرزو دل ہی میں دم توڑ دے گی اور حقوق کی تمام ہاؤ ہو بے معنی اور بے مصرف ہو کر رہ جائے گی۔

اس قدر طویل تمہید کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ وطن عزیز کے باسیوں کو بھی خواب غفلت سے بیدار کرنے کی مقدور بھر سعی کی

جاتے اور دوسرا مقصد یہ بتانا تھا کہ جہاں پوری قوم ہی حقوق طلبی کے مرض میں مبتلا ہو وہاں بے بصر حضرات اس سے کیوں کر مستثنٰی ہو سکتے ہیں۔ بے بصر حضرات میں بھی حقوق کے بارے میں زیادہ بات ہوتی ہے اور فرائض کی بات کم سے کم دیکھنے اور سننے میں آتی ہے۔ اکثر بے بصر حضرات حصول علم اور حصول منصب کے بعد اپنی زندگی کی مصروفیات میں کھو کر رہ جاتے ہیں اور اس تحریک کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں جس نے انہیں وہاں تک پہنچانے میں گراں بہا کوشش کی ہوتی ہے لیکن میں قارئین کی توجہ ایک اہم پہلو کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں یہ مسئلہ پیچیدہ بھی ہے اور فکر انگیز بھی کیونکہ اس کا تعلق جہاں بے بصر حضرات سے ہے وہاں بابصر حضرات بھی اس میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر کوئی نابینا فرد کسی سکول میں معلم ہو تو اس پر لازم ہے کہ دلچسپی سے اپنے فرائض سرانجام دے بلکہ بینا حضرات سے بھی زیادہ اپنی صلاحیتوں کو عمل میں لائے کیوں کہ وہ جہاں بھی ہو نابینا حضرات کی نمائندگی کر رہا ہوتا ہے لیکن عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ خود بینا حضرات نابینا استاد سے فرائض کی توقع نہیں کرتے اور ان کو ترحم کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ادارے کا انچارج اسے عام طور پر فرائض سونپتا ہی نہیں وہ سمجھتا ہے کہ جہاں اتنا سٹاف موجود ہے وہاں اگر نابینا اُستاد کو فارغ بھی رہنے دیا جائے تو فرق کیا پڑتا ہے (بیچارہ نابینا ہے دعائیں دے گا۔) یہی حال کئی اور جگہ بھی دیکھنے میں آتا ہے اگر

کوئی نابینا شخص کسی دفتر یا فیکٹری میں ملازم ہے تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ ہمارا یہ مطلب قطعی نہیں کہ تمام بے بصر حضرات تندھی سے اپنے فرائض سر انجام نہیں دیتے بعض بے بصر افراد تو اپنے بینا رفقائے کار سے بھی کہیں زیادہ بڑھ کر کارکردگی سر انجام دیتے ہیں نشاندہی دراصل اس رویے کی کرنا ہے جو اس احساس ترحم کے باعث ہمارے معاشرے میں در آیا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے کوئی شخص بغیر کام کئے کوئی اجرت حاصل نہیں کر سکتا تا آنکہ اس قدر معذور نہ ہو کہ کوئی فرض بھی سر انجام نہ دے سکے اور ایسے شخص کے لئے بیت المال موجود ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں ہمارا خیال یہ ہے کہ جہاں نابینا افراد اپنے رفقائے کار کے بے جا ترحم سے استفادہ کرتے ہیں وہاں بینا افراد کے رویوں میں بھی تبدیلی پیدا کرنے میں کوئی کردار ادا نہیں کر رہے ہوتے۔ تلخ حقیقت یہ ہے کہ اصحاب بست و کشاد جو ملازمین کو فارغ الفرائض قرار دے کر یہ تاثر قائم کر لیتے ہیں کہ نابینا سرے سے کوئی کام نہیں کر سکتے بے کار ہیں ادارے پر بوجھ ہیں ان کا کوئی فائدہ نہیں اور اس صورت حال کے پیش نظر وہ نابینا حضرات جو اپنے فرائض کماحقہ سر انجام دیتے ہیں اور دل و دماغ کی تمام صلاحیتیں صرف کر دیتے ہیں ان کے بارے میں بھی اس طرح کے غلط تاثرات مفروضے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو ان کے لئے اور دیگر نابیناؤں کے لئے سم قاتل اور زہر ہلاہل سے کسی طرح کم نہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ جہاں نابینا حضرات اپنے حقوق کی بات کرتے ہیں وہاں انہیں اپنے فرائض بھی اپنی تمام تر ذہنی اور بدنی صلاحیتوں کے ساتھ ادا کرنے چاہییں۔ بینا برادری کا اخلاقی اور قانونی فریضہ ہے کہ کوئی فرد صلاحیت کی بنیاد پر جہاں ہے اسے اس کے فرائض سرانجام دینے میں اس کی پوری مدد اور اعانت کریں تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ نابینا افراد کا یہ دعویٰ کہ وہ تعلیم و تربیت کے بعد بینا دوستوں کے ساتھ شانہ بشانہ کام کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔ درست ہے۔

بایونک آنکھ

میرے ایک دوست نے مجھے ایک دن کہا کہ جب اخبار پڑھتا ہوں تو مجھے بخار ہو جاتا ہے اس لیے اخبار پڑھنا چھوڑ دیا ہے لیکن کبھی کبھی اخبارات میں ایسی خبریں بھی ہوتی ہیں جن سے بخار اتر جاتا ہے ایسی ہی ایک خبر کا ذکر آپ سے کروں گا لیکن قدرے تاخیر سے۔ یہ کوئی ساٹھ کی دہائی کی بات ہے کہ ایک اخبار نے خبر لگائی "اب کوئی اندھا نہیں رہے گا" اگرچہ لفظ اندھے سے ہمیں نابینائی کی کیفیت سے بھی زیادہ دکھ ہوتا تھا لیکن بہت خوشی ہوئی۔ معلوم یہ ہوا کہ خبر کا تعلق قرنیہ کی پیوند کاری سے ہے یہ یقیناً ایک بہت بڑی خبر تھی۔ اس سے سینکڑوں بے بصر، بصارت کے اجالوں سے بہرہ ور ہوتے۔ بعض زعما نے کہا کہ آنکھوں کی پیوند کاری اسلامی نقطہ نظر سے درست نہیں تاہم اتنی بڑی نعمت کو کون غیر اسلامی سمجھ سکتا تھا۔ اجالوں کا مذہب اجالے عطا کرنے کے خلاف کیونکر ہو سکتا تھا تاہم آنکھوں کا عطیہ پاکستان سے دستیاب نہ ہو سکا کیونکہ قرنیہ کی پیوند کاری کے لیے ضروری ہے کہ مرنے والے کی آنکھ چوبیس گھنٹے کے اندر حاصل کر لی جائے اور تقریباً اتنی ہی مدت میں استعمال ہو جائے عطیات آتے، بہت عطیات آتے لیکن سری لنکا سے اور کئی آنکھیں جو

اندھیروں کے سپرد ہو گئی تھیں دیتے لگیں لیکن قرنیے کا تعلق صرف آئی بال سے ہوتا ہے اگر ریٹینل ڈیٹیچمنٹ (Retinal Detachment) واقع ہو جائے تو بینائی بحال نہیں ہو سکتی سیلن جس خبر کا ذکر اب آپ سے کرنا ہے اس کے مطابق ایسا ممکن ہو سکے گا چنانچہ قارئین کے استفادے کے لئے روزنامہ جنگ لاہور میں شائع ہونے والی خبر کا متن درج ذیل ہے۔

لاہور (نیوز ڈیسک) ایک نابینا نوجوان کی آنکھ میں ٹی وی کیمرہ لگانے کے انتظامات کر لیے گئے ہیں۔ یہ نوجوان چھ سال قبل ایک حادثے میں بینائی کھو بیٹھا تھا۔ واشنگٹن کے قریب نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ کے سائنس دانوں کی ایک ٹیم نے یری ہمبرچ کی سربراہی میں دنیا کی پہلی بایونک آنکھ تیار کی ہے آپریشن کے ذریعے نوجوان کی ایک آنکھ نکال کر یہ مشینی آنکھ فٹ کر دی جائے گی جو ایک ننھے سے کیمرے پر مشتمل ہے یہ کیمرہ تاروں کے ذریعے 256 الیکٹروڈز سے منسلک ہو گا ہر الیکٹروڈ دماغ میں نیورونز کے ایک گچھے سے منسلک ہو گا اس طرح کیمرے سے آنے والے سگنلز دماغ میں شبیہیں پیدا کریں گے نیورونز کو الیکٹروڈز سے منسلک کرنا دشوار کام ہو گا اس میں کامیابی ہو گئی تو کیمرہ نوجوان کی آنکھ میں فٹ کرنا ضروری نہیں ہو گا وہ اسے ہاتھ میں رکھ سکے گا بلکہ ریموٹ کیمرے بھی استعمال کر سکے گا۔ بایونک آنکھ سے بننے والی شبیہیں بلیک اینڈ وہائٹ ہوں گی۔

بی بی سی کے ایک نشریہ میں وضاحت کی گئی کہ اس سے زیادہ تر بوڑھے لوگ استفادہ کر سکیں گے۔ ہماری رائے میں اس طرح کی کوششیں مستحسن ہیں لیکن اس کا کیا کیجیے کہ دنیا بھر کی دولت کا ساٹھ ستر فیصد حصہ دیو جنگ و جدل کی اشتہا کو بجھانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ دہشت گردی، شاہ گری اور شاہ شکنی کے عفریت کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ اگر انسانیت زندہ رہنا چاہتی ہے تو ہمیں انسان کے دکھوں کی طرف توجہ دینا ہو گی سائنس نے جس قدر ترقی کر لی ہے انسانی ذہن جس قدر چاک و چوبند ہو گیا ہے اور مادی ذرائع جس سرعت سے بڑھتے جا رہے ہیں اس کے پیش نظر بعید نہیں کہ بصارتیں سماعتیں اور دیگر حسیات ہر ایک کے حصے میں آنے لگیں کوئی معذور نہ رہے کوئی دکھی نہ ہو ہر ایک زندگی ہنسی خوشی گزارتے ہوئے اسے خوب تر بنانے میں ہمہ تن گوش رہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان پھر انسان ہونا سیکھ لے اور اس میں کسی کے دکھوں کو محسوس کرنے کی صلاحیت پھر سے لوٹ آئے۔

نابینائی اور خواب

کون ہے جس کی آنکھ میں خواب جلوہ گر نہیں ہوتے جو خوابوں کے پائیں باغ میں چہل قدمی نہیں کرتا۔ خوابوں سے اٹھکیلیاں نہیں کرتا۔ شاعر لفظوں سے خواب بنتا ہے۔ موسیقار سروں سے خوابوں کے گھروندے بناتا ہے۔ مصور رنگوں کے ذریعے خواب تراشتا ہے اور ایک عام انسان اپنی حسرتوں اور خواہشوں کے تانے بانے سے خواب سجاتا ہے۔ اگر خواب نہ ہوں تو زندگی بے کیف اور بے مصرف ہو کر رہ جائے۔ یہ خواب ہی تو ہیں جن کو دیکھنے کے لئے ہم سوتے ہیں اور جن کی تعبیر کے لئے ہم بیدار ہوتے ہیں جن کے لئے ہم نے شام و سحر تراش رکھے ہیں۔ روز و شب کے ہیولے تیار کئے ہوتے ہیں گویا خواب کے خمیر ہی سے زندگی کی تعمیر ہوتی ہے۔ تو پھر ایک شخص جو بینائی کی دولت سے محروم ہے اسے خواب بننے کے لئے، سجانے کے لئے کیا کرنا پڑے گا۔ لیکن اس سے قبل کہ میں خواب اور حقیقت کے حوالے سے نابینائی پر بات کروں ایک حیرت کا اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہوں مجھے ایک بار سے زیادہ پوچھا گیا کہ کیا میں خواب دیکھتا ہوں؟ کیا مجھے خواب میں دکھائی دیتا ہے؟ میں کیسے خواب دیکھتا ہوں؟ اور یہ سوال دراصل اس غلط فہمی کی وجہ سے کیے جاتے ہیں جس کے

باعث اس طرح کے اور بہت سے سوالات بھی عام طور پر کیے جاتے ہیں۔ غلط فہمی یہ ہے کہ بینائی ضائع ہو جانے سے شاید کسی شخص کی نفسیات ہی تغیر پذیر ہو جاتی ہیں۔ اس کی سائیکی میں کوئی انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ اس کے خواب و خیال بدل جاتے ہیں۔ بظاہر تو یہ سچ ہے کہ نابینائی کی جھلستی ہوئی دھوپ زندگی کا کوئی پھل پھول باقی نہیں رہنے دیتی۔ جلا دیتی ہے، خاک کر دیتی ہے لیکن اگر اس دھوپ کو محبت کے سائبان میسر آ جائیں، اس کے آنچل لہرانے لگیں، رہنمائی، پذیرائی اور رسائی کے بادل آسمان زندگی پر تیرنے لگیں تو پھر جذبوں کی رم جھم اور خوابوں کی پھوہار جاری رہتی ہے خواب بھی آتے ہیں، ان کی تعبیریں بھی نکلتی ہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ خواب ہماری جیتی جاگتی دنیا کا عکس ہوتے ہیں بعض حضرات کا خیال ہے کہ خواب (Oracle of Delphi) کا کام سرانجام دیتے ہیں۔ ہماری جھولیاں تعبیروں سے بھر دیتے ہیں۔ ہمیں مستقبل کی نوید سناتے ہیں اور مستقبل میں ہونے والے حادثات سے بھی آگاہ کر دیتے ہیں۔ فرائڈ کا یہ خیال ہے کہ خواب ہماری دبی ہوئی خواہشات کی سسکیاں ہوتے ہیں۔ ہماری حسرتوں کے نالے اور ہماری تمناؤں کے نوحے ہوتے ہیں لیکن بعض حضرات کے خیال میں خواب دن میں نظر آنے والے خوابوں کی پرچھائیاں ہوتے ہیں تو پھر ایک نابینا شخص کے خواب وہی ہوں گے جو وہ دن میں خیال کرتا ہے محسوس کرتا

ہے جیسے جیتے جاگتے ہوئے اشخاص کے ہیولے اس کے ذہن میں ہوتے ہیں اسی طرح خوابوں میں ان ہیولوں کے پیکر اسے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ دن میں بے بصری کا عالم ہو اور رات کے وقت خواب بقعہ نور بن جائیں۔ ہمارے خواب ہمارے خیالات کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ ہمارے جذبوں کی شاخ پر نمودار ہوتے ہیں ان کی کونپلیں ہماری تمناؤں سے پھوٹتی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ایک نابینا شخص ایک بینا شخص کی طرح خوابوں کے تسلط میں ضرور ہوتا ہے اسے بھی خواب سجانے آتے ہیں۔ وہ بھی خوابوں کی نیلم پریوں سے آنکھ مچولی کھیلتا ہے وہ بھی سوچتا ہے کہ اس کی زندگی خوشیوں سے بھر جائے اس کی صبحیں امید کا پیغام لائیں اس کی شامیں تمناؤں سے لبریز ہوں وہ سوئے تو سکون کی نیند سوئے اور جاگے تو بھرپور زندگی گزارے اس کے خواب دراصل اس کے اپنے ہاتھ میں نہیں ہوتے یا کم از کم اس حد تک نہیں ہوتے جس حد تک ایک بینا شخص کے ہوتے ہیں اگر معاشرہ مہربان ہو افراد اس کی مشکلات کو سمجھیں۔ صاحب اقتدار لوگ نابینا حضرات کے لئے تعلیم و تدریس کا اہتمام کریں انہیں سہولتیں میسر ہوں۔ وہ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو کر اپنی روزی کمانے کے قابل ہو سکیں اور روزگار حاصل کرنے کے بعد ازدواجی زندگی گزارنے کی سکت حاصل کر سکیں تو ان کے خواب بینا حضرات کے خوابوں سے مختلف نہیں ہوں گے۔ ان کے خواب انہیں ڈرائیں گے بھی اور بہلائیں گے بھی۔

وہ اپنی زندگی اسی طرح گزار سکیں گے جس طرح بینا حضرات گزارتے ہیں۔ روتے ہوئے ہنستے ہوئے، جیتتے ہوئے، ہارتے ہوئے، محبت کرتے ہوئے، نفرت کرتے ہوئے۔ انہیں ایسے خواب دیکھنے دیجیے جیسے خواب کی تمنا آپ کو ہے انہیں اپنے خوابوں کی تعبیریں نکالنے کا موقع دیجیے جیسے آپ اپنے خوابوں کی تعبیریں نکالتے ہیں۔ انہیں ان کے خواب لوٹا دیجیے۔ انہیں بھی خوابوں پر حق ہے۔ بالکل اتنا ہی حق جتنا کہ کسی بینا شخص کو ہوتا ہے۔

مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا

یاد ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

بیس تیس سال پہلے جب میں یہ شعر پڑھا کرتا تھا تو مجھے اس کا مفہوم تو معلوم تھا لیکن اس کی ماہیت گیرائی اور گہرائی مجھ پر غالباً اب منکشف ہوئی ہے لیکن شاید ابھی پوری طرح نہ ہوئی ہو لیکن میرا خیال ہے کہ میں نے بڑی حد تک اس شعر میں جو دنیا پنہاں ہے اس کا ادراک کر لیا ہے اپنے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ میں اس کی شیرینی اور تلخی کی موسیقی سے بہرہ ور ہوتا ہوں اور اس کا عرق کشید کر کے دل و جان کو تقویت دینے کا کچھ نہ کچھ سامان کرتا رہتا ہوں۔ بیس تیس سال پہلے مجھے کم معلوم تھا کہ وہ واقعات جو سرسری سے لگتے ہیں دل و جان میں خنجر بن کر پیوست ہو جائیں گے۔ میں اپنی گفتگو کو ان رنگ و نور کی وادیوں تک تو نہیں پھیلانا چاہتا جہاں سے مجھے آج بھی ایسی ہوائیں محسوس ہوتی ہیں جو مجھے اپنی آغوش میں لے کر لوریاں دیتی ہوئیں کسی اور انجانی وادیوں میں پہنچا دیتی ہیں جس کا شاید کوئی وجود ہی نہیں لیکن میں ان یادوں کے دروازے پر دستک دینا چاہتا ہوں جن سے میں اپنا تعلق تمام تر کوشش

کے باوجود منقطع نہ کر سکا۔

مجھے یاد ہیں وہ لمحات جو میری زندگی میں ایک امتحان بن گئے تھے۔ میں بینائی سے محروم ہو گیا اور شاید زندگی سے بھی لیکن نہیں۔ بعض شیریں ہاتھوں نے میرے دامن میں زندگی پھر سے ڈال دی لیکن جان کنی کا عمل کسے بھولتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ وہ لمحات کتنے جان لیوا اور جاں گسل تھے میں تنہائیوں میں کھو گیا تھا لیکن شاید میں ابھی اتنی سکت رکھتا تھا کہ کچھ لمحات سسک سکوں اور پھر یوں ہوا کہ مجھے آہستہ آہستہ یہ احساس ہونے لگا کہ بینائی چھن گئی ہے تو کیا ہے زندگی تو باقی ہے جسے میری طرح کے کتنے لوگ ہنسی خوشی گزار رہے ہیں۔ اور احساس کی یہ شعاع میرے شعور پر اس وقت روشن ہوئی جب میں ایک بے بصر افراد کے سکول میں داخل ہوا جو شیراں والا گیٹ لاہور میں آج بھی روشنیاں بکھیر رہا ہے وہ شعاع کچھ اس قدر تابناک تھی کہ مجھے اندھیروں کا احساس ہی نہ رہا لیکن جان کنی کا عمل بہت کڑا ہوتا ہے۔ میں میٹرک، ایف۔ اے، بی۔ اے، ایم۔ اے کرنے کے باوجود اور زندگی سے معانقہ کرنے کے باوجود مکمل طور پر نہیں بھلا پایا۔ عروس زندگی مجھ پر بہت مہربان رہی اس کی زلفوں کے سائے مجھے جھلستی ہوئی دھوپ سے بچاتے رہے اس کے حسن میں بینائی

نہ ہوتے ہوئے بھی کچھ اس طرح کھو گیا کہ بینائی کو بھی رشک آنے لگا۔ میں رنگ و بو کی دنیا میں جانے کتنا لطف اٹھاتا رہا لیکن پھر بھی جان کنی کے اس احساس کو کبھی محو نہ کر پایا جو چند لمحات چند مہینے اور چند سال مجھ پر محیط رہا اور شاید کبھی نہیں کر پاؤں گا۔

یہی وجہ ہے کہ آج بھی میں جب کسی کو اس طرح کی جان کنی کی کیفیت میں دیکھتا ہوں تو مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ روشنی کی اس شعاع کا کچھ حصہ اس شخص کے حوالے کر دوں جو ایڑیاں رگڑ رہا ہے اور جان کنی کی کیفیت سے دوچار ہے اس کے لئے میں نے اور میرے ساتھیوں نے ایک روشن گھر تعمیر کرنے کی ٹھان رکھی ہے ۔جہاں بینائی سے محروم افراد اکتساب فیض کر سکیں گے اور ایک شیراں والا گیٹ لاہور، سرگودھا میں تعمیر ہو جائے گا۔ جہاں میں اور میرے ساتھی ڈویژن بھر کے سینکڑوں بے بصر افراد کو زیور علم و ہنر سے آراستہ کر سکیں گے۔ بحمد اللہ صوبائی حکومت نے نیو سیٹلائیٹ ٹاؤن کے قریب سرو سبز کالونی سے ملحق 9 کنال قطعہ اراضی لیز پر دے دیا ہے۔ جہاں ہم یہ روشن گھر تعمیر کرنا چاہتے ہیں اور بجھی ہوئی زندگی کو توانائی عطا کرنا چاہتے ہیں کیونکہ جان کنی کے وہ لمحات بڑے ہی قیامت خیز ہوتے ہیں جن سے میں گزرا۔ جانے کتنے گزرے اور کتنے گزر رہے ہیں تو دعا یہ ہے کہ خدا اس

تجربے سے کسی کو دوچار نہ کرے اور تمنا ہے کہ اس تجربے سے دوچار ہوئے بغیر ہی ہر کوئی جان لے کہ جان کنی کا یہ عمل کیا ہوتا ہے اور اس روشن گھر کی تعمیر کے لئے درہمے، دامے، سخنے، قدمے ہماری مدد کرے۔

نابینائی اور رجائیت

ایک کہانی پڑھا کرتے تھے کہ کسی کا ایک پاؤں ٹوٹ گیا اور اس نے اس پر اظہار افسوس کرنے کی بجائے کہا کہ چلیے یہ بھی ٹھیک ہی ہے کہ اب مجھے ایک جوتا پہننا پڑے گا۔ کہتے ہیں کہ یہ انداز مثبت انداز ہوتا ہے۔ ہر شے کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ رجائی اور مثبت پہلو کو مدنظر رکھا جائے۔ جو کھو گیا سو کھو گیا جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب بھلا واویلا کرنے سے کیا فائدہ۔ پریشان ہونے سے پریشانی اور بڑھے گی۔ اسے نفسیات کی اصطلاح میں Rationalisation کہتے ہیں۔ یعنی یہ کہ انسان سوچ لے کہ اب جو کچھ ہو چکا ہے اس کا الٹ ممکن نہیں اس لیے اسی صورت حال سے سمجھوتا کر لیا جائے اسی طرح کا ایک رویہ Grape - Sour Reaction بھی ہوتا ہے جسے اردو میں انگور کھٹے ہیں سے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے۔ یعنی جو نہ ہو سکے اسے کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ اسے آپ تساہل پسندی بھی کہہ سکتے ہیں۔

بہر کیف یہ دونوں رویے اپنی جگہ اہم ہو سکتے ہیں۔
لیکن نابینا حضرات میں جو رجائیت ہوتی ہے اس کی صورت حال ہمارے خیال میں مختلف ہوتی ہے جب کوئی بچہ بینائی کھو بیٹھتا ہے تو اس کا دائرہ

عمل مختصر ہو جاتا ہے اسے سماجی اور ثقافتی اجتماعات میں شرکت کا موقع کم سے کم ملتا ہے۔ اکثر و بیشتر وہ اپنے گھر کا ہو رہتا ہے یا پھر ایسے اداروں میں چلا جاتا ہے جو بے بصر افراد کے لئے قائم ہوتے ہیں اور عام طور پر پرانے انداز کے ایسے ادارے عملی زندگی کی ہاؤ ہو سے خالی ہوتے ہیں۔ نابینا حضرات اپنے جیسے ساتھیوں میں رہ کر نابینائی نہ ہونے کا خیال ہی ذہن میں نہیں لاتے کیونکہ ایسی کوئی صورت حال پیدا ہی نہیں ہوتی۔ ان کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے۔ اساتذہ بھی عام طور پر نابینا ہی ہوتے ہیں اور اگر ایک آدھ بینا استاد ہو بھی تو وہ بھی ان کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ بس پھر کیا، ایک نئی دنیا تشکل ہو جاتی ہے۔ ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے۔ کوئی دکھ نہیں ہوتا اگر دکھ ہو بھی تو قہقہے اتنے بلند ہوتے ہیں کہ دکھ کا احساس نہیں ہوتا۔ زندگی گزرتی چلی جاتی ہے اور نابینا بچہ جوان اور پھر بوڑھا ہو جاتا ہے۔

کیونکہ ایسے اداروں میں نابینا بچہ آٹھ دس سال گزار لیتا ہے اور پھر اس کو اسی ادارے میں کوئی کام مہیا کر دیا جاتا ہے اور وہ اپنا پیٹ پالنے کا اہتمام کر لیتا ہے بس وہ خوش رہتا ہے۔ یہاں نہ کوئی صبح ہوتی ہے اور نہ کوئی شام۔ سورج اپنی روپہلی کرنیں بکھیرتا ہے اور نہ ہی عروس شب اپنے حسن کا دامن پھیلاتی ہے بس زندگی سمٹتی چلی جاتی ہے ہنسی ہنسی خوشی خوشی۔ یہاں حُسن کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ کوئی قباحت

نہیں ہوتی زندگی کی بڑی بڑی آزمائشیں در حیات پر دستک نہیں دیتیں کیونکہ یہاں رہنے والے ایک ایسی زندگی گزارتے ہیں۔ جہاں نہ ماں باپ کی نصیحتیں ہوتی ہیں اور نہ ہی بچوں کے تقاضے اور نہ ہی بیویوں کے مطالبے۔ پاس ہوتا ہے مگر وہ بھی نہ ہونے کے برابر۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ نابینا ہیں اگر ہنس کھیل لیتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

میں بھی ایسی دنیا کا باسی رہا ہوں۔ جہاں کھیل کود کے سوا اور کچھ بہت کم تھا۔ یہ الگ بات کہ میں نے اور کچھ ساتھیوں نے اس دنیا سے جلد بوجوہ رستگاری حاصل کر لی۔ یہ وہ دنیا تھی۔ جہاں بظاہر ہر روز روزِ عید تھا اور ہر شب شب برات۔ اگر آپ چاہیں تو رات بھر کھیلتے چلے جایئے دن بھر سوتے جایئے۔ اس کے لئے آپ کو کسی کے سامنے اگر جوابدہ بھی ہونا پڑا تو کوئی سنجیدہ بات نہیں ہو گی۔ یہاں کے رہنے والے ہمیشہ ہنستے مسکراتے کھیلتے کودتے گاتے دوڑتے دکھائی دیتے تھے۔ یہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتے تھے اور بینا حضرات سے زیادہ فعال۔ سارا جہان ان کا تھا سب کچھ ان کے لئے بنا تھا اگرچہ ان کی دنیا وہی دنیا تھی جس میں وہ رہتے تھے۔

آپ اسے رجائیت کہہ لیجیے اور بظاہر یہ اچھا بھی تھا کم از کم تنہائی کا عذاب تو نہیں تھا کوئی یہ احساس دلانے والا نہ تھا کہ آنکھیں چھن گئیں۔ دنیا چلی گئی ہے دیکھو فلاں اتنا کامیاب ہو گیا ہے اس کے

پاس فلاں فلاں سہولیات ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مقابلے کی کوئی صورت ہی موجود نہیں ہوتی تھی۔

لیکن کیا دنیا یہی ہے کیا دنیا کے تقاضے یہی کچھ ہیں انسان کی صلاحیتیں اسی قدر محدود ہیں کیا ایک چھوٹی سی اقامت گاہ پورا شہر، پورا ملک اور پوری دنیا ہے ہر گز نہیں۔ ہمارے خیال میں نابینا حضرات کی یہ رجائیت ان کے محدود تجربے کی رہین منت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں خوب تر کی تلاش کا جذبہ ہی پیدا نہیں ہونے دیا جاتا یا نہیں ہو پاتا۔ وہ جانتے ہی نہیں کہ ہر لحظہ نئے طور اور نئی برق تجلی کا لطف کیا ہوتا ہے اور یہ کہنا ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں حسن کی دلفریبیاں کیا ہیں اور عشق کی وارفتگی کسے کہتے ہیں زلفوں کا پیچ وخم کیا ہوتا ہے اور عروس زندگی کا سحر کسے کہتے ہیں گویا ایک احمقوں کی جنت آباد کر لیجیے اور خوش رہیے۔ مجھے خوشی پر تو کوئی اعتراض نہیں مگر خوشی دل و دماغ سے پھوٹنی چاہیے پورے معاشرتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہونی چاہیے کیونکہ نابینا حضرات کوئی الگ تھلگ مخلوق نہیں ہیں بلکہ اس جیتی جاگتی زندگی کا حصہ ہیں جہاں صبح بھی ہوتی ہے اور شام بھی۔ جہاں اندھیرے بھی ہیں اور روشنی بھی جہاں آنسو بھی ہیں اور قہقہے بھی۔

ممکن ہے میرے نقطہ نظر سے اتفاق نہ کیا جائے مجھے اس پر اعتراض نہیں لیکن میری رائے میں نابینا حضرات کو ایک محدود

دائرے میں محبوس کر دینا انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ انہیں ہنسنے دیجیے اور انہیں رونے دیجیے۔ انہیں چلنے دیجیے گرنے دیجیے اور پھر اٹھنے دیجیے۔ زندگی ایک بار ملتی ہے اسے گوشہ عافیت بنا کر بات نہیں بنے گی۔ نہ زندگی کا لطف آئے گا۔ ہم رجائیت کے نام پر نابینا افراد کو محروم حیات کیوں کریں۔ اس کا حق کسی کے پاس نہیں۔ نہ کسی کو ملنا چاہیے مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ انہیں عام اداروں میں تعلیم دی جائے۔ زندگی کے عام دھارے میں شامل کیا جائے اور انہیں اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ ہنسیں اور روئیں اور رونے کے بعد آنسو پونچھنے کے قابل ہو سکیں۔ یہی نہیں بلکہ دوسروں کے آنسو بھی پونچھ سکیں تاکہ وہ بھی یہی زندگی گزاریں جو زندگی ہم سب کی زندگی ہے چاہے وہ ہنسی ہو یا گریہ، جیت ہو یا ہار،

ریسورس ٹیچرز کی تعیناتی

خواہ ایک فرد ہو یا پوری قوم، تعلیم انتہائی ناگزیر رہی ہے اور فرد کے لئے بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ پوری قوم کے لئے۔ یہ سچ ہے کہ افراد کا اجتماع ہی ایک قوم کہلاتا ہے لیکن ہماری مراد یہاں ایک فرد سے ہی ہے کیونکہ اس کی اہمیت سے صرف نظر ممکن ہی نہیں۔ اگر کسی گاؤں یا کسی شہر میں ایک فرد بھی ناخواندہ رہ جائے تو اس کی زندگی اندھیری ہو سکتی ہے اور رزندگی ایک فرد کو ایک ہی بار ملتی ہے خواہ وہ کسی گاؤں میں رہتا ہو، کسی قصبے میں ہو یا کسی بہت بڑے شہر میں۔

نابینا فرد بھی بہر صورت اور بہر تشریح ایک فرد ہوتا ہے اس لیے اس کی تعلیم کا انتظام وانصرام پوری توجہ کا مستحق ہے۔ یہ سچ ہے کہ ملک کے ہر گاؤں اور شہر میں نابیناؤں کے لئے سکول قائم کرنا ممکن ہے اور نہ ہی ضروری۔ وہ فرد کسی شہر میں جا کر تعلیم حاصل کر سکتا ہے لیکن اگر اس کے والدین اس کی نابینائی کے پیش نظر اسے دور بھیجنا نہ چاہیں یا وہ کچھ اور وجوہ سے اپنے گھر سے دور نہ جا سکے تو پھر کیا صورت ہونی چاہیے۔ اس مسئلے کے حل کے لئے عام سکولوں میں ایسے اساتذہ کی تعیناتی کی جانی چاہیے جو بریل جانتے ہوں تاکہ نابینا فرد بریل سیکھ کر عام بچوں کے ساتھ

عام طریقہ تدریس سے استفادہ کر سکیں۔ ایسے استاد یا معلم کو Resource Teacher کہا جاتا ہے۔ کہیں کہیں ایسے اساتذہ کی تعیناتی ہوتی بھی ہے لیکن خاطر خواہ نتائج اس لیے برآمد نہیں ہوتے کیونکہ ایسے اساتذہ سے کوئی کام نہیں لیا گیا اور نہ ہی عوام کو یہ معلوم ہو سکا کہ کس ادارے میں ایسے اساتذہ کام کر رہے ہیں۔

کم و بیش ہر شہر میں اور ہر قصبے میں بلکہ گاؤں میں بھی ایک آدھ نابینا ضرور ہوتا ہے۔ اگر ہر سکول میں Resource Teacher کی تعیناتی ممکن ہو یا کم از کم بڑے سکولوں میں اس منصوبے پر عمل کیا جائے تو بڑی خدمت سرانجام دی جا سکتی ہے۔ ایسا استاد صرف نابیناؤں کو ہی تعلیم نہیں دے گا جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے بلکہ اسے عام استاد کے طور پر تعینات کیا جائے اور وہ سکول کے دوسرے طلباء کے لئے بھی تدریسی فرائض سرانجام دے سکتا ہے۔ اس کا ایک یا دو پیریڈ نابینا بچوں کے لئے مختص کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کوئی خاص مالی وسائل بھی صرف نہیں ہوں گے اور نابیناؤں کے ملازمت کے مسائل بھی حل ہو سکیں گے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ نابینا حضرات شروع ہی سے بیناؤں کے ساتھ تعلیم پا کر سماجی رویوں سے پوری طرح آشنا ہو جائیں گے اور بینا اور نابینا بچوں میں افہام و تفہیم ممکن ہو سکے گی جس کے فقدان کے باعث بہت

سے مسائل سر اٹھاتے رہتے ہیں اور اس ذہنی ہم آہنگی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ نابینا بچہ کوئی غیر معمولی مخلوق متصور نہیں ہو گا۔

موجودہ صورت میں ڈویژنل سطح پر نابیناؤں کے لئے سکول قائم ہیں اور ان پر کروڑوں روپیہ خرچ ہو رہا ہے لیکن نابینا بچوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے جس کی بہت سے وجوہات ہیں جن کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ سائنٹیفک خطوط پر تعلیم و تدریس کا اہتمام کیا جائے تاکہ خاطر خواہ نتائج بر آمد ہو سکیں۔ جیساکہ مغربی ممالک میں ہوا ہے۔ گزشتہ روز سماجی بہبود کے وفاقی وزیر نے ایک تقریب میں اعلان کر دیا کہ نابیناؤں کے لئے تمام پرائمری سکولوں کو ہائی سکولوں کا درجہ دے دیا جائے گا۔ ان کے اس بیان سے ان کی نیک نیتی کا تو پتہ چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نابیناؤں کے لئے نرم گوشہ رکھتے ہیں لیکن کیا ایسا عملاً ممکن ہے یا کیا اس سے استفادہ کرنے کی کوئی عملی صورت ہے اس کے لئے گہری مشاورت کی ضرورت ہے۔

ہمارے خیال میں Resource Teachers کا قیام موجودہ حالات میں ہمارے لئے ازبس ضروری ہے کیونکہ اس طرح ہم ہر شہر اور گاؤں میں نابیناؤں کے لئے تعلیم کا اہتمام کر سکتے ہیں لیکن

ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ انتظامی ذرائع سے اس سکیم کو قابل عمل بنایا جائے اور عملی طور پر استفادہ کی صورت نکالی جائے۔ عوام الناس میں اس منصوبے کو متعارف کروایا جائے اور ضلعی اور ڈویژنل سطح پر اہتمام کیا جائے کہ نابینا بچوں کے والدین بچوں کو سکولوں میں داخل کرائیں انہیں ترغیبات بھی دی جائیں اور سہولتیں بھی۔ اس طرح ہم پورے ملک میں نابیناؤں کے لئے تعلیم کا اہتمام کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے اور قومی طور پر سرخرو بھی کہ ہم نے کسی کو معذور سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا اور نہ ہی زبانی جمع خرچ سے کام لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نابیناؤں کے لئے بیناؤں سے بھی کہیں زیادہ تعلیم کی ضرورت ہے کیونکہ آنکھ سے نہ دیکھنے کے باعث انہیں بہت کچھ تعلیم و تربیت سے حاصل کرنا ہوتا ہے اور روزگار کے مواقع ایک بینا ناخواندہ کے مقابلے میں نابینا ناخواندہ کے لئے سرے سے ہیں ہی نہیں۔

نابینا افراد اور ان کے گائیڈ

اگر چہ جدید صورت حال میں نابیناؤں کے لئے گائیڈ کی ضرورت نسبتاً کم ہو گئی ہے کیونکہ انہیں سفید چھڑی کے ذریعے چلنے کی تربیت فراہم کر دی جاتی ہے۔ جسے موبیلٹی ٹریننگ کہتے ہیں۔ نابینا فرد سفید چھڑی کے ذریعے جہاں چاہے چلا جاتا ہے کیونکہ سفید چھڑی اسے زمینی نشیب و فراز سے پوری طرح آگاہ رکھتی ہے اور پھر دیکھنے والوں پر یہ لازم ہے کہ وہ سفید چھڑی والے افراد کی طرف خصوصی توجہ دیں۔ سڑک عبور کرانے میں اس کی مدد کریں اور ڈرائیورز حضرات بھی یہ خیال رکھیں کہ سفید چھڑی تھامے ہوتے جو شخص آ رہا ہے اس کا بھی سڑک پر اتنا ہی حق ہے جتنا کہ بینا حضرات کا۔

بہ ایں ہمہ سفید چھڑی پاکستانی سیاق و سباق میں زیادہ مفید ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ اول تو اس کے بارے میں خاطر خواہ معلومات ہی عوام الناس کو فراہم نہیں کی گئیں اور پھر ہمارے ہاں جو بے نیازی اور بے پرواہی کی ایک رو جاری ہے اس کے پیش نظر سفید چھڑی کوئی زیادہ مفید ثابت نہیں ہوتی۔ اگرچہ ہمیں یقین ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ سفید چھڑی عوام الناس میں متعارف ہو گی اور وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس

کریں گے لیکن موجودہ صورت حال میں ایسے نابینا افراد اور خصوصاً خواتین جو کسی کو ساتھ لے کر چلتے ہیں ہمیں ان کے مسائل پر گفتگو کرنا ہے اور دیکھنا ہے کہ ایک اچھے گائیڈ کی کیا ذمہ داریاں ہونا چاہییں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اچانک کسی نے ازراہ ہمدردی کسی نابینا فرد کا ہاتھ تھام لیا لیکن پھر بھول گیا کہ ان کے ساتھ کوئی نابینا فرد ہے اور یوں بہت سے ایسے حادثات ہوئے کہ اگر نابینا اکیلا ہوتا تو ان کا بالکل امکان نہیں تھا کیونکہ نابینا فرد یہ سمجھتا ہے کہ اس کے ساتھ ایک بینا فرد ہے اور بینا یہ بھول گیا کہ اس کے ساتھ کوئی نابینا فرد ہے اور یوں کئی فرد نابینا افراد پہلی سیڑھی سے لمحوں میں آخری سیڑھی پر پہنچ گئے اور پھر کئی ماہ ہسپتال میں رہے۔ کبھی پاؤں میں موچ آگئی اور کبھی کسی چیز سے ٹکرا گئے اور پھر بینا ساتھی نے معذرت کر لی۔ لیکن اس پرخلوص معذرت کا کوئی فائدہ نہیں۔ نابیناؤں کے رہنما کا تربیت یافتہ ہونا یا کم از کم [illegible] یافتہ ہونا انتہائی ضروری ہے۔ اور اسے ہر لمحہ یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اس کے ساتھ ایک نابینا فرد ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر و بیشتر نابینا افراد بینا افراد کے ساتھ چلتے ہوئے بھی اپنے تحفظ کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں آہستہ چلتے ہیں یا پھر سفید چھڑی استعمال کرتے ہیں۔

تاہم نابینا افراد کے گائیڈ کی ذمہ داریاں انتہائی اہم ہیں

لیکن ایسا ممکن نہیں یا کم از کم موجودہ حالات میں ممکن نہیں کہ تربیت یافتہ گائیڈ دستیاب ہوں کیونکہ اس ضمن میں کہیں کوئی تربیت گاہ موجود نہیں اور پھر یہ کہ اگر ایسی سہولت ہو بھی تو کون یہ تربیت حاصل کرے گا کیونکہ ہمارے ہاں نابینا افراد کی مالی پوزیشن عام طور پر ایسی ہوتی ہی نہیں کہ وہ کسی گائیڈ کو اجرت ادا کر سکیں یا باقاعدہ اپنے ساتھ رکھ لیں ہوتا یہی ہے کہ دوست احباب، اعزہ و اقربا۔ یہ فرض سرانجام دیتے ہیں اور آہستہ آہستہ چند ایک حادثات کے بعد انہیں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ ان کی بڑی ذمہ داری ہے اور انہیں ذہنی طور پر چاق و چوبند رہنا ہے۔ اتفاقیہ گائیڈ کا ذکر پہلے کر چکے ہیں۔

بہر حال اگر کوئی شخص رضا کارانہ طور پر یا اجرتاً یہ فریضہ سرانجام دے تو اسے چند باتیں ذہن میں ضرور رکھنی چاہییں۔ اسے چاہیے کہ وہ چلتے وقت نابینا فرد سے کچھ آگے رہے تاکہ اس انداز سے نابینا فرد کو راستے کا وقت سے پہلے ہی کچھ اندازہ ہوتا رہے۔ اگر کوئی کھائی یا گڑھا عبور کروانا ہو تو گائیڈ کا فرض ہے کہ پہلے وہ عبور کرے تاکہ نابینا فرد کو کچھ اندازہ ہو سکے کہ اسے کتنی چھلانگ لگانا ہے اسی طرح گائیڈ کو چاہیے کہ وہ سنبھل کر اپنے نابینا ساتھی کا ہاتھ تھامے تاکہ کسی ناخوشگوار صورت حال میں اسے سنبھال سکے۔ ہماری رائے میں نابینا فرد کو بازو سے، کندھے سے

یا ایسے انداز سے نہیں تھامنا چاہیے جس سے دور ہی سے یہ پتا چل جائے کہ نابینا فرد آ رہا ہے کوشش یہ کی جانی چاہیے کہ پکڑنے کا نارمل طریقہ کار ہو تاکہ نابینا فرد خواہ مخواہ نمایاں نظر نہ آئے۔

گائیڈ کا فرض ہے کہ جب وہ جس جگہ جائے تو وہ سیڑھیوں پر چڑھتے وقت نابینا ساتھی کو دیوار کے ساتھ یا کسی سہارے کے ساتھ اوپر چڑھنے دے۔ اسی طرح اسے کرسی پر بٹھاتے وقت بھی اسے صورت حال سے آگاہ رکھے۔ گائیڈ کا فرض ہے کہ کسی تقریب میں نابینا فرد کو مینو سے پوری طرح آگاہ کرے تاکہ اسے سب کچھ معلوم ہو۔

اکثر و بیشتر یہ بھی ہوا ہے کہ گائیڈ بغیر بتائے تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی کہیں چلا جاتا ہے اور نابینا فرد یہ جان کر کہ گائیڈ اس کے ساتھ ہے کوئی بات کرتا رہتا ہے اسی طرح جب گائیڈ بغیر بتائے واپس آ جاتا ہے تو نابینا فرد یہی سوچ رہا ہوتا ہے کہ اس کا گائیڈ ابھی نہیں آیا۔ اس صورت حال سے اجتناب کی ہر ممکن ضرورت ہے۔ اسی طرح ایسے بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص نابینا فرد سے سوال کرتا ہے مگر جواب گائیڈ دینا شروع کر دیتا ہے کوشش یہ کی جانی چاہیے کہ اگر سوال نابینا فرد سے متعلق ہے یا اس سے کیا گیا ہے تو جواب وہی دے۔ اس طرح محفل میں نابینا فرد کو صورت حال سے آگاہ رکھا جانا چاہیے۔ اس کے ساتھ کون بیٹھا ہے یا محفل

میں کون کون موجود ہیں۔ کون آیا ہے کون چلا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

گائیڈ کی ذمہ داریاں بہت ہیں اسے نابینا فرد کو ہر ممکن طریقے سے سفر کی سہولت فراہم کرنی چاہیے اگر کپڑوں پر کوئی داغ لگ گیا ہو تو بتا دینا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ ایسی صورت حال پیدا نہ ہو لیکن یہ سب کچھ اس طرح ہونا چاہیے کہ گائیڈ ناصح، استاد، ناقد یا حاکم کا رول ادا نہ کرے بلکہ انتہائی دوستانہ انداز میں شراکت کے انداز میں یہ سب کچھ کیا جانا چاہیے تاکہ نابینا فرد کا سفر آسانی سے کٹے، دلچسپ ہو جائے اور کوئی ناخوشگوار صورت حال بھی درپیش نہ ہو۔ گائیڈ کو گائیڈ ہی رہنا چاہیے اور نابینا فرد سے زیادہ نمایاں ہونے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اپنے تعلقات استوار کرنے کی بجائے اسے نابینا فرد کو یہ موقع دینا چاہیے کہ وہ صورت حال سے آگاہ رہے، وہ جسے ملنے جا رہا ہے اسے اس کے قریب تر بٹھانے کی کوشش کرے کیونکہ نابینا فرد کو سارا کام سماعت سے لینا ہوتا ہے اس کا کام اشاروں سے اور کناؤں سے نہیں چل سکتا۔ وہ دور سے زیادہ کامیابی سے گفتگو میں شریک نہیں ہو سکتا۔

یہ چند ایسی تجاویز ہیں کہ اگر گائیڈ انہیں ملحوظ نظر رکھے تو نابینا فرد میں اعتماد پیدا ہو گا اس کا سفر خوشگوار گزرے گا۔ اس میں خود اعتمادی پیدا ہو گی لیکن اس کے لئے انتہائی قربانی اور ایثار کی

ضرورت ہے۔ اور یہ امر ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ نابینا فرد کا زندگی پر اتنا ہی حق ہے جتنا کہ کسی بینا فرد کا۔ اور یہ کہ اس کی محسوسات اتنی ہی نازک ہوتی ہیں جتنی کہ کسی اور فرد کی۔

نابینائی اور خود اعتمادی

آفاقی اقدار امتداد زمانہ سے متاثر نہیں ہوتیں۔ یہ سدا بہار پھول ہوتی ہیں۔ جن کی خوشبو پھیلتی ہی چلی جاتی ہے۔ فضاؤں اور ہواؤں میں ایسی تازگی اور شگفتگی پیدا کرتی ہیں کہ زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہونے لگتی ہے۔ انہی اقدار میں سے ایک قدر خود اعتمادی ہے۔ کیا خوب ہوتے ہیں وہ لمحے جب انسان اعتماد کی قندیل جلاتے ہوتے تیرہ و تاریک راہوں سے گزرتا ہے اور اپنی منزل سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔

دراصل خود اعتمادی ہی زندگی ہے۔ وہ لوگ جو اس جوہر سے عاری ہوتے ہیں زندہ تو ہیں مگر زندگی کی برکات و فیوض سے محروم رہتے ہیں۔ ان کی تقدیر میں وہ خوشیاں اور وہ مسرتیں نہیں ہوتیں جو کامیاب زندگی کا طرہ امتیاز ہیں۔ اقبال اس حقیقت کو جس شدت سے محسوس کرتے تھے۔ اس کا اظہار انہوں نے اپنے اشعار میں جس بھرپور انداز سے کیا ہے وہ صرف اور صرف انہی کا حصہ ہے۔ اقبال نے اس جوہر بے بہا کو خودی کا نام دیا ہے۔

نائب حق در جہاں بودن خودی است
بر عناصر حکمراں بودن خودی است

بر مقام خود رسیدن زندگی است
ذات را بے پردہ دیدن زندگی است
منکر حق نزد ملاں کافر است
منکر خود نزد من کافر تر است
یہ موج نفس کیا ہے؟ تلوار ہے
خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے؟ راز درون حیات
خودی کیا ہے؟ بیداری کائنات
تراشیدم صنم برصورت خویش
بہ شکل خود خدا را نقش بستم
مرا از خود بروں رفتم محال است
بہ ہر رنگ کہ ہستم خود پرستم

کلام اقبال پڑھتے جائیے خودی کی روشنی تیز تر ہوتی چلی جائے گی۔ خودی کے چراغوں کی لو پھیلتی چلی جائے گی۔ زندگی کی شب تاریک بقعہ نور بن جائے گی اور بحر حیات سے وہ موتی دریافت ہوں گے جو انسانیت کی پھیلی ہوئی جھولی کو مالا مال کر دیں گے اور انسان ماورائے حقیقت کا ادراک حاصل کرنے لگے گا۔ وہ مشت خاک کی بجائے جوئندہ آفاق بن جائے

گا اور ایک مینارہ نور کی صورت نظر آئے گا۔ اقبال نے یہ نسخہ کیمیا ایک دم توڑتی ہوئی قوم کے لئے تجویز کیا تھا۔ وہ قوم جس نے بے بسی کے بت اپنے ہاتھوں سے تراش کر ان کی پوجا پاٹ شروع کر دی تھی۔ ایسی قوم جو اپنے اسلاف کے کارناموں کو بھی وہم وگماں تصور کرنے لگی تھی۔ جس کے سامنے ذات سیاہ سانپ کے مماثل تھی جو سوچنے لگی تھی کہ حواس خمسہ سراب ہیں۔ سب مائع ہے۔ سب بیکار اور بے مصرف ہے۔ لیکن وقت کی آندھیاں چلیں اور امت مسلمہ کو احساس ہوا کہ اسے صفحہ ہستی سے مٹایا جا رہا ہے اور پھر ایسے میں اقبال جیسے نبض شناس نے قوم کو وہ نغمے سنائے جن سے ان میں زندگی پیدا ہوئی۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم بے بصر افراد کو بھی وہی نغمے سنائیں، انہی گیتوں کا رس ان کے کانوں میں گھولیں جس کے باعث ملت بیضا ایک بار پھر افق پر ابھری تھی اور اس نے اجالوں کا سفر شروع کیا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ خود اعتمادی اصل حیات ہے۔ نابینا حضرات کچھ اپنے دکھ درد کے باعث اور کچھ ہمدردیوں اور تسلیوں کے بوجھ کے نیچے دب کر اس انتہائی قابل قدر صلاحیت کو کھو بیٹھتے ہیں اور انہیں یہ یقین سا ہو جاتا ہے کہ وہ مجبور و لاچار ہیں بے مصرف اور بے کار ہیں۔ درس عبرت ہیں اور محض حرماں نصیبی کی ایک تصویر ہیں۔ جو خدا نے

بندوں کو جھنجھوڑنے کے لئے تراشی ہے لیکن جب نابینائی کے اس اندھیرے میں ہمت کا کوئی جگنو جگمگانے لگتا ہے تو پھر آہستہ آہستہ خودی کی تعمیر ہونے لگتی ہے۔ خود اعتمادی کی عمارت بلند ہونے لگتی ہے۔ یہ جگنو، یہ شمعیں، یہ قندیلیں، وہ افراد اور وہ ادارے ہوتے ہیں جو بے بصری کے اس عالم میں انہیں اعتماد، حوصلہ، قوت عمل اور قوت ارادی عطا کرتے ہیں۔ انہیں علم و ہنر سکھاتے ہیں اور انہیں زندگی کی جنگاہ میں ہتھیاروں سے لیس کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھ سے کشکول چھین کر انہیں علم و ہنر کے خزانے عطا کرتے ہیں اور پھر یہ بے چارگی کی تصویریں ہمت کے کوہ گراں بن جاتی ہیں۔ حوصلوں کے الاؤ بپا کرتی ہیں لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ محض خیالستان آباد نہ کیے جائیں انہیں سادھوؤں کے حوالے نہ کر دیا جائے انہیں ایسی روش پر نہ چلا دیا جائے جس پر چل کر وہ نام نہاد پیروں فقیروں کا روپ دھار لیں اور سادہ کاغذوں پر الٹی سیدھی لکیروں سے افراد اور اقوام کی تقدیریں رقم کرنے کے عارضے میں مبتلا ہو جائیں اور پھر ہذیان کی سی کیفیت پیدا ہو جائے جسے یار لوگ صدائے رحمانی کہنے لگیں۔

خود اعتمادی عملی تدابیر کے اختیار کرنے سے عبارت ہے۔ خود اعتمادی ذات کے بحر ذخار سے موتی نکالنے کا نام ہے۔ خود اعتمادی پھول

کی خوشبو، آفتاب کی روشنی، دریا کی روانی اور صدا کی دلکشی ہے۔ یہ خزانہ دل سے دریافت ہوتا ہے۔ یہ دولت ذات کے مدفن میں موجود ہوتی ہے۔ یہ شعاع کہیں باہر سے اندر نہیں جاتی ہے بلکہ خود اندر موجود ہوتی ہے۔ صرف اس کا ادراک اور احساس ضروری ہے۔

نابینائی کے حوالے سے یہ عرض کرنا بھی انتہائی مناسب ہو گا کہ اس صورت حال میں جہاں خودی کی موت واقع ہو سکتی ہے وہاں خودی کو ایک نئی زندگی بھی مل سکتی ہے۔ کیونکہ ابتلاء و آزمائش خود اعتمادی کو جنم دیتی ہے جب مشکلات بڑھتی ہیں تو زندہ افراد اور اقوام اس کے مقابلے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور جوں جوں مشکلات بڑھتی چلی جاتی ہیں اسی قدر مقابلے کی خواہش خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر دیتی ہے۔

"Greater the challenge, better the response"

کے مصداق مشکلات مثبت انقلاب پیدا کرتی ہیں لیکن اس کے لئے اندرونی صلاحیت ناگزیر ہے اور اگر یہ صلاحیت موجود ہو اور ہمارے خیال میں یہ ہمیشہ موجود ہوتی ہے تو نابینائی اور خود اعتمادی لازم و ملزوم ٹھہرتی ہیں۔

وہی امیر کے ٹکڑے وہی غریب کا پیٹ

ہم رفاہ عامہ، فلاح عوام، بہبودی قوم کے جتنے دل کش نعرے لگائیں حقیقت یہ ہے کہ ان نعروں کے پس منظر میں ایک ایسا جذبہ کار فرما ہوتا ہے جسے مستحسن کہنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس میں کلام نہیں کہ مستحقین اور حاجت مندوں کی حاجت روائی جس طرح بھی ہو اچھی بات ہے کیونکہ اس دور میں بھی جہاں مساوات، جمہوریت اور برابری کے دعوے کرتے زبان نہیں تھکتی۔ در حقیقت طبقات میں تفاوت اور عدم مساوات بری طرح موجود ہے۔ اب بھی متمول ممالک مفلوک الحال ممالک کی ضروریات سے اسی طرح کھیلتے ہیں جس طرح جاگیر دار عوام کے جذبات کا استحصال کیا کرتے تھے۔ اب بھی امراء اور غرباء میں نہ صرف حد فاصل قائم ہے بلکہ ان کی نفسیاتی دنیائیں مطلقاً مختلف ہیں۔ آج بھی دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ کو کم تر، مجبور اور بے بس سمجھ کر اپنی حس تفاخر کو تسکین دیتا ہے۔ اپنی دریا دلی پر اتراتا ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے اپنے بھائی کی مدد ایک ایسا فریضہ ہے جسے ادا نہ کرنا گناہ ہے اور بعض حالات میں گناہ کبیرہ، اسی طرح مہذب دنیا میں اس طرح کی امداد سماجی زندگی کی بقا کے لئے ناگزیر ہے۔ جس میں دینے والا اسی

قدر فائدہ میں رہتا ہے جس قدر کہ لینے والا کیونکہ عدم مساوات زدہ معاشرہ بہت جلد شکست و ریخت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ اور پھر نیست و نابود بھی ہو جاتا ہے۔ اسی خیال کے پیش نظر فلاحی تنظیموں اور بہبود کے اداروں کی ضرورت محسوس ہوئی تا کہ ایک فرد براہ راست دوسرے فرد کی حاجت روائی کر کے اسے احساس کمتری سے دوچار نہ کر سکے اور خود احساس برتری کا شکار نہ ہو کیونکہ دونوں صورتیں خوشحال معاشرے جنم نہیں دیتیں۔ پاکستان میں سینکڑوں تنظیمیں موجود ہیں۔ جو مختلف معاشرتی بھلائی کے فرائض سرانجام دے رہی ہیں۔ لیکن ایسے اشخاص کی تعداد میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ جو ان کی مساعی کی سرپرستی کرنا تو درکنار ان کی حوصلہ افزائی تک نہیں کرتے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ایسے اداروں کا ریکارڈ کچھ اچھا نہیں رہا ہے۔ کچھ لوگ ذاتی فائدوں کے لئے تنظیمیں قائم کر لیتے ہیں اور پھر خوب خوب اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ اس ضمن میں حکومت اور عوام کا فرض ہے کہ ایسی تنظیموں کو بے نقاب کریں۔ جو فلاح کے نام پر اپنا الو سیدھا کرنے میں منہمک ہیں اور اس طرح مخلصانہ کاوشوں کے لئے بھی مشکلات کا باعث بن رہی ہیں۔ اس ضمن میں طریقہ ہائے کار پہلے سے ہی موجود ہے۔ یہ الگ بات کہ جہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہو وہاں ایسی مساعی مخلصانہ انداز سے ہوتی ہی نہیں اگر ہو بھی تو زیادہ کامیاب نہیں

ہوتی۔ تاہم ہر ایک فلاحی ادارے اور سماجی بہبود کے بارے میں بغیر تحقیق کے کسی طرح کے مفروضے قائم کر لینا مہذب افراد اور معاشروں کو زیب نہیں دیتا۔

لیکن اس وقت محل نظر اس قسم کی صورت حال نہیں ہے بلکہ اس رجحان کی طرف توجہ دلانا ہے۔ جس کا اشارہ پہلے بھی کیا جا چکا ہے کہ افراد کی ایک بہت بڑی تعداد فلاحی تنظیموں کی حوصلہ افزائی سے گریزاں اس لیے نہیں کہ انہیں ان کی کارکردگی پر کوئی شک ہے۔ بلکہ اس طرح ان کا زعم سخاوت سکون پذیر نہیں ہوتا۔ ایسے افراد براہ راست افراد کی مدد کرنا چاہتے ہیں اور پھر ہر دوست اور ملنے والے سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ دیکھو۔ "خدا کا فضل ہے کہ اس نے مجھے توفیق دی کہ میں نے فلاں کی مدد کی بے چارہ بہت مجبور تھا روتا ہوا میرے پاس آیا۔ اس کے بچے بھوکے تھے" مجھ سے رہا نہ گیا میں نے دل کھول کر مدد کی۔ اب جہاں کہیں ملتا ہے ممنونیت کی نگاہ سے میری طرف دیکھتا ہے"

"اس کے پاس داخلہ کی فیس تھی نہ بیچارہ کتابیں خرید سکتا تھا۔ میں نے فوراً مدد کی۔ تم پھر بھی مجھے کنجوس کہتے ہو"

"دیکھیے جی ہم اس طرح سے آپ کی تنظیم کی مدد نہیں کر سکتے آپ ان اشخاص کے پتے دے دیں۔ جنہیں اس کی ضرورت ہے۔ ہم براہ

راست ان کی مدد کر دیں گے۔"

اس طرح متمول اور نام نہاد مخیر حضرات اپنی انا کی تسکین کا سامان کرتے رہتے ہیں اور پھر افراد پر ہی کیا موقوف پچھلے دنوں ایک حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ زکواۃ کی رقم اداروں کو بھجوانے کی بجائے افراد کو دیا کرے گی۔ اس طرح براہ راست ان کی مدد ہو گی۔ ہو سکتا ہے اس میں کوئی نیک پہلو بھی مضمر ہو لیکن حکومتیں اکثر ایسے اقدام افراد کی خوشی حاصل کرنے کے لئے کیا کرتی ہیں۔ تاکہ بوقت ضرورت ان کی خوشی کو کیش کرایا جا سکے۔ بہت پڑھے لکھے افراد بھی اس نفسیاتی عارضے کا شکار پائے گئے ہیں۔ ہمیں یہ اصرار نہیں کہ ایسی تنظیمیں سچ مچ مستحقین کی مدد کرتی ہیں لیکن ہماری گزارش یہ ہے کہ ان تنظیموں کی بد نیتی کو اس انداز سے درست نہیں کیا جا سکتا۔ ضروری ہے کہ مخیر حضرات تنظیموں کی کارکردگی کو بہت قریب سے جانچنے کی کوشش کریں اور حقائق اکٹھے کریں اور پھر دل کھول کر مدد کریں۔ تنظیمیں سماجی بہبود کے منصوبوں کو کہیں بہتر انداز میں پایہ تکمیل تک پہنچا سکتی ہیں۔ ان تنظیموں کے پاس ایک ایسا ڈھانچہ موجود ہوتا ہے جس کی مدد سے فلاحی کاوشیں دور رس نتائج حاصل کر سکتی ہیں۔ تربیت یافتہ عملہ کی موجودگی ایسی کاوشوں کو بطریق احسن پروان چڑھا سکتا ہے۔ اور پھر جن افراد کی مدد ہوتی ہے وہ کسی

فرد کا ممنون احساس نہیں ہوتے اور اگر وہ کسی ادارے کے ممنون احساس ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ وہ اس طرح ادارہ کی کاوشوں کو آگے بڑھانے میں اپنا حصہ بھی ڈال سکتے ہیں۔

یہی کافی نہیں کہ آپ کسی فرد کی حاجت روائی کر دیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ اس فرد میں اعتماد پیدا کریں اور اس میں اپنی ذات کا احترام بھی پیدا ہو۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہو سکے تو ایسا شخص معاشرے کا بھرپور رکن نہیں بن سکتا بلکہ ہمیشہ احساس کمتری میں مبتلا رہتا ہے۔ ضروری ہے کہ ایسے افراد پیدا ہوں جو بلا غرض معاشرتی شعور کے پیش نظر افراد کی مدد معاونت میں اس انداز سے پیش پیش ہوں کہ مثبت انداز سے معاشرے کی تعمیر ہو سکے۔ لیکن ایسا اس وقت ممکن ہو گا جب امیر غرباء کو اپنے ٹکڑوں پر پلتے دیکھنے کی مریضانہ خواہش سے دست کش ہوں اور ایسا اس وقت ممکن ہو گا۔ جب ہم صحیح فلاحی خدمات کے تصور کو عام کر سکیں گے اور یہ باور کرا سکیں گے کہ کسی کی امداد ہم پر اس قدر ضروری ہے جس قدر اپنی بقا کا خیال اور یہ کہ جن معاشروں میں ان احساسات کا فقدان ہوتا ہے وہاں غریب ہی نہیں امیر بھی لقمہ اجل بن جاتے ہیں اور بے وقت موت انہیں آ گھیرتی ہے۔ اور نجات کی پھر کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔